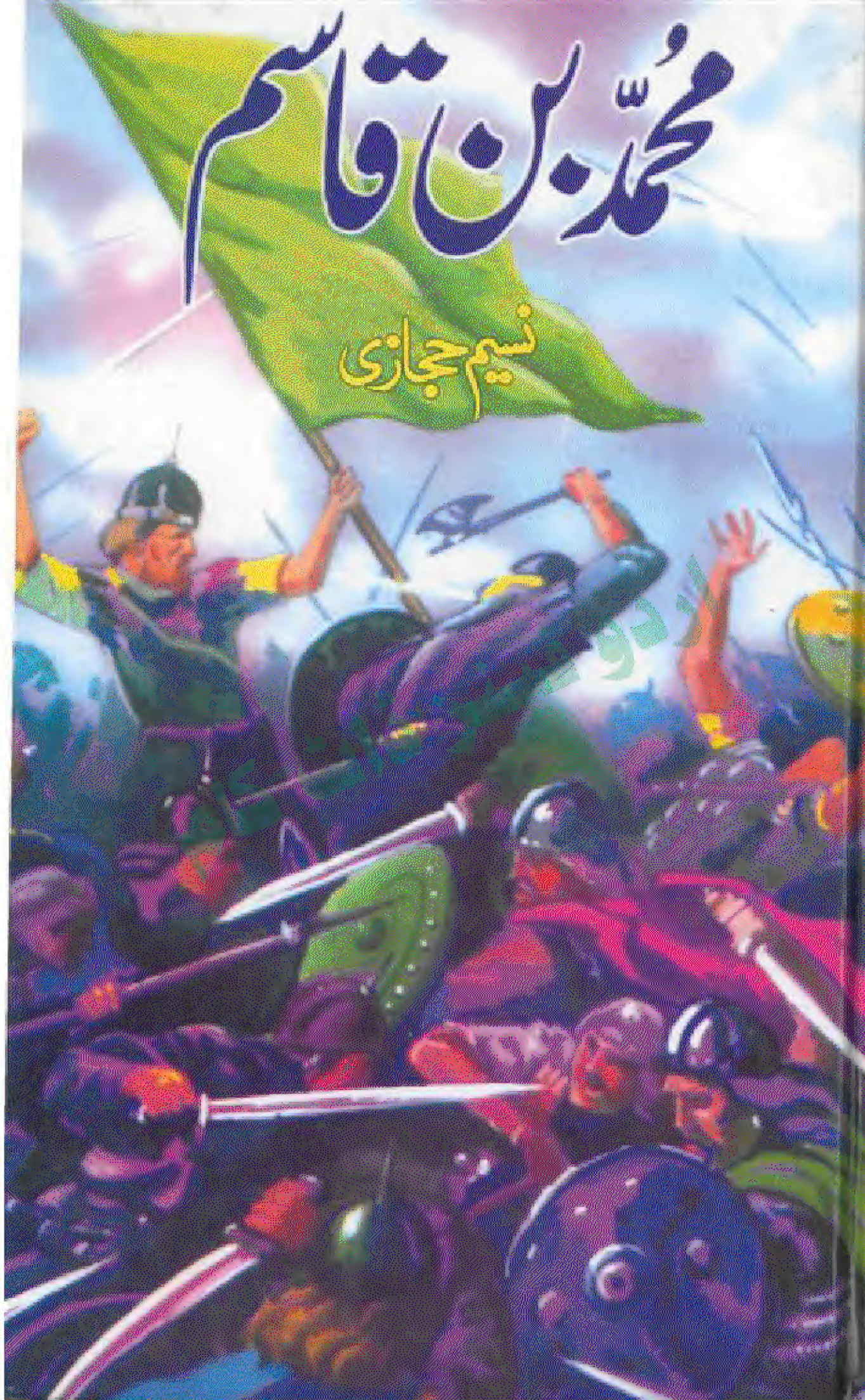


محمد بن قاسم

نسیم حجازی



محمد بن قاسم

اردو فیسز ڈاٹ کام

نسیم حجازی

چھانگیر بک ڈپو

• لاہور • راولپنڈی • ملتان • فیصل آباد • حیدر آباد • کراچی

جملہ بحق مصنف محفوظ ہیں

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی فوٹو کاپی، سکیننگ یا کسی بھی قسم کی اشاعت مصنف کی تحریری اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail: info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

اشاعت: 2006

ٹاکسٹ: جہانگیر بک ڈپو

سرورق: JBD آرٹ سیکشن، لاہور

قیمت: 225/- روپے



ناشر: عدیل نیاز، آفس: 257 ریواڑ گارڈن، لاہور۔ فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: 051-5552929
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدر آباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔ فون: 061-4781781
سیلز ڈپو: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار، فیصل آباد۔ فون: 0333-4469077
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔ فون: 042-7314319

پہلا حصہ

نامہ

- ابوالحسن ۹۰
سرانڈیپ کے دربار میں ۴۲
فتنہ ۴۰
گلگو اور اس کی سرگزشت ۴۰
دیل ۹۱
قیدی ۱۰۵
مایا کی پریشانی ۱۱۸
بہن اور بھائی ۱۲۴
دوست اور دشمن ۱۵۰
آخری امید ۱۶۴

دُورِ اِحْتِصَاف

کَمَن اور نوجوان سالار

حِصَّہٴ اوّل

نہایت

۱۹۹	قَتیبہ کا ایچی
۲۲۷	بصرہ سے دمشق تک
۲۴۱	سپاہی اور شہزادہ
۲۶۲	پہلی فتح
۲۸۸	سب کا محسن
۳۰۴	صبح کا ستارہ
۳۱۳	سندھ کا نیا سپہ سالار
۳۲۹	راجہ داہر کی آخری شکست
۳۴۱	برہمن آباد سے اورنگ
۳۵۸	اُن کا دیوتا
۳۷۱	سیمان کا قیدی
۳۷۹	غروب آفتاب

الحسن

ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندرگاہوں اور جزیرہ سراندیپ کے ساتھ ایک مدت سے عربوں کے تجارتی تعلقات چلے آتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں چند عرب تاجر سراندیپ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور جب عرب میں ایک نئے دین کا پرچا ہونے لگا، تو یہ دین ان تاجروں کو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ لیکن ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلے میں عربوں کی شاندار فتوحات کی خبریں سن کر ان کی قومی عصبیت جاگ اُٹھی ایران، عرب کے مقابلے میں ایک متمدد ملک سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے بازاروں میں عرب کے مقابلے میں ایران کی مصنوعات کی زیادہ قدر تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حکمران ایران کو ایک طاقتور ہمسایہ خیال کرتے تھے، اور عربوں کے مقابلے میں ایرانی تاجروں کو زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر شام سے کوئی قافلہ آ جاتا، تو روم کی قدیم سطوت سے مرعوب ہندوستانی چاہیں بھی عربوں سے زیادہ مراعات دیتے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی شاندار

تم وہاں جانا پسند کرو تو میں تمہارے لیے ہر سہولت مہیا کرنے کے لیے تیار ہوں۔
عبدالشمس نے جواب دیا: ”آپ کے منہ سے میرے دل کی دہی ہوتی آواز نکلی ہے۔
میں جانے کے لیے تیار ہوں!“

پانچ عرب تاجروں کے سوا باقی سب عبدالشمس کا ساتھ دینے کے لیے تیار
ہو گئے۔

دس دن بعد بندرگاہ پر ایک جہاز کھڑا تھا اور عرب اپنے بال بچوں سے نصرت
ہورہے تھے۔ عبدالشمس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے سینے پر پتھر رکھ کر اپنی اکلوتی
بیٹی کو الوداع کہا۔ اس لڑکی کا نام سلی تھا۔ شہر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اسے نسوانی حسن
کا بلند ترین معیار تصور نہ کرتا ہو۔ شاہسوار اسے تندو سرکش گھوڑوں کو دوڑاتے اور بہترین
تیراک اسے خوفناک آبشاروں میں کودتے اور سمندریں پھلی کی طرح تیرتے دیکھ کر دم بخود
رہ جاتے تھے۔

عبدالشمس کی روانگی کے بیس دن بعد کاٹھیاواڑ کے تاجروں کا ایک جہاز
بندرگاہ پر رکا اور عبدالشمس اور اس کے دو ساتھیوں نے اتر کر یہ خبر سنا لی کہ ان کا جہاز
اور دوسرے ساتھی سمندر کی لہروں کا شکار ہو چکے ہیں اور اگر کاٹھیاواڑ کے تاجروں
کا جہاز وقت پر نہ پہنچتا تو وہ بھی چند ساعت اور پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ڈوب
جاتے۔

راجہ نے اس حادثے کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی۔ سندھی
تاجروں کے سردار کا نام دلیپ سنگھ تھا۔ راجہ نے اسے دربار میں بلایا اور تین عربوں
کی جان بچانے کے عوض اسے تین ہاتھی انعام دیے۔ راجہ کو مہربان دیکھ کر
دلیپ سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے وہاں آباد ہونے کا خیال ظاہر کیا۔ راجہ
نے خوشی سے ان کی یہ درخواست منظور کی اور شہر میں خزانے کے لیے

فتوحات نے عربوں کے متعلق ہمایہ ممالک کے باشندوں کا زاویہ نگاہ تبدیل کر دیا۔
سراندیپ اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں آباد ہونے والے وہ تاجر
جو ابھی تک عرب کے اندرونی انقلاب سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ کفر کے مقابلہ میں
اسلام کی فتوحات کو اپرائیڈوں اور رویوں کے مقابلہ میں عرب کی فتوحات سمجھ کر خوشی
سے چھوٹے نہیں سمجھتے تھے۔ عربوں کے نئے دین سے ان کی نفرت اب محبت میں تبدیل
ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں جن لوگوں کو عرب حملے کا اتفاق ہوا وہ اسلام کی نعمتوں
سے مالا مال ہو کر واپس آئے۔

عبدالشمس عرب تاجروں کا سرگروہ تھا۔ اس کا خاندان ایک مدت سے
سراندیپ میں آباد تھا۔ وہ اسی جزیرے میں پیدا ہوا۔ اور اسی جگہ آباد ہونے والے ایک
عرب خاندان کی لڑکی سے شادی کی۔ جوانی سے بڑھاپے تک اس کے بحری سفر بھی
سراندیپ سے کاٹھیاواڑ تک محدود رہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عرب میں اس کے
خاندان کے دوسرے افراد کون ہیں اور کس جگہ رہتے ہیں۔

دوسرے عربوں کی طرح وہ بھی مادروطن کے ساتھ اس وقت دلچسپی لینے لگا۔
جب یروشلم اور قادیسیہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کی خبریں دنیا کے ہر گوشے
میں پہنچ چکی تھیں۔

موجودہ راجہ کے باپ کو انہی خبروں نے عرب کے ایک گناہ تاجر کی طرف دوستی
کا ہاتھ بڑھانے پر آمادہ کیا تھا۔ اس نے عبدالشمس اور اس کے ساتھیوں کو دربار میں بلایا
اور بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔

سنگھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد نئے راجہ نے سخت نشین ہونے ہی عبدالشمس
کو بلایا اور کہا: ”مدت سے ہمارے ملک میں تمہارے ملک کا کوئی تاجر نہیں آیا۔ میں عرب
کے تازہ حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے نئے دین کے ساتھ دلچسپی ہے۔ اگر

مکان تعمیر کروا دیے۔

چند سال کی وفادارانہ خدمات کے بعد ولیپ سنگھ راجہ کے بحری بیڑے کا افسر اعلیٰ بنا دیا گیا۔

(۲)

اس واقعے کے تین سال بعد ابوالحسن پہلا مسلمان تھا جسے تجارت کا ارادہ اور تبلیغ کا شوق اس دور افتادہ جزیرے تک لے آیا۔

کئی ہفتوں کے سفر کے بعد ایک صبح ابوالحسن اور اس کے ساتھی جہاز پر کھڑے سرانڈیپ کے سرسبز ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بندرگاہ کے قریب مرد، عورتیں اور بچے کشتیوں پر سوار ہو کر اور چند تیرتے ہوئے لوگ جہاز کے استقبال کو نکلے۔ ایک کشتی پر ابوالحسن کو جزیرے کی سیہ نام اور نیم عریاں عورتوں کے درمیان ایک اجنبی صورت دکھائی دی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید اور شکل و صورت جزیرے کے باشندوں سے بہت مختلف تھی۔ دوسری کشتیوں سے پہلے جہاز کے قریب پہنچنے کے لیے وہ اپنی کشتی پر کھڑی دو ترمز مند ملاحوں کو جو کشتی کے چپو چلا رہے تھے، ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔

یہ کشتی تمام کشتیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جہاز کے ساتھ آگئی۔ لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور اس نے بیدار نگاہوں کا جواب دینے کی بجائے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ابوالحسن کے ساتھیوں کو بھی عورتوں کا نیم عریاں لباس پسند نہ آیا۔ حسین لڑکی نے جہاز والوں کی بے اعتنائی کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے سرانڈیپ زبان میں کچھ کہا لیکن جہاز پر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اچانک ابوالحسن نے کسی کی چیخ پکار سُن کر نیچے دیکھا۔ کشتی سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر وہی خوبصورت لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی تھی اور کشتی والے

اس کی چیخ پکار کے باوجود سخت بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن نے پہلے رشتی کی سیڑھی بھینکی لیکن جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں اور وہ سیڑھی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کپڑوں سمیت سمندر میں کود پڑا لیکن لڑکی اچانک پانی میں غائب ہو گئی اور وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں بہت سی کشتیاں جہاز کے گرد جمع ہو چکی تھیں اور جزیرے کے باشندے قہقہے لگا رہے تھے۔

ابوالحسن نے تین مرتبہ غوطہ لگانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر سیڑھی کی رشتی پکڑ لی اور وہ جہاز پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اُدھر سے اس کا ساتھی چلانے لگا۔ ”وہ ادھر ہے، جہاز کے دوسری طرف۔ وہ ڈوب رہی ہے۔ شاید کسی مچھلی نے پکڑ رکھا ہے۔“

مقامی مردوں اور عورتوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ ابوالحسن لڑکی کے جہاز کی دوسری طرف پہنچنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ تشویش اور حیرانی کے طے جملے جذبات کے ساتھ اس نے جلد ہی پھر غوطہ لگایا اور جہاز کے نیچے سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا، اُدھر سے اس کا وہی ساتھی شور مچا رہا تھا۔ ”وہ ڈوب گئی۔ اُسے کھلی نکل گئی۔“

ابوالحسن مایوس ہو کر پھر دوسری طرف پہنچا۔ اس دفعہ لوگوں کے قہقہوں میں اس کے ساتھی بھی شریک تھے اور ایک عرب نے کہا: ”آپ آجلیئے! وہ آپ سے بہتر تیر سکتی ہے۔“

ابوالحسن نے کھسیا نہ ہو کر سیڑھی پکڑ لی لیکن ابھی ایک ہی پاؤں اُدھر رکھا تھا کہ کسی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر پانی میں گر ادیا۔ اس نے سنبھل کر ادھر ادھر دیکھا تو لڑکی تیزی سے سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔

ابوالحسن جہاز پر پہنچا تو اس کے ساتھی پریشان سے ہو کر جزیرے کی لڑکی کے قہقہے سن رہے تھے۔

لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھ کر عربی زبان میں کہا: ”مجھے آپ کے بھیگ جانے کا بہت افسوس ہے۔“

لڑکی کے منہ سے عربی کے الفاظ سن کر سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔
ابوالحسن نے پوچھا: ”کیا تم عرب ہو؟“

لڑکی نے ایک طرف سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کا پانی پھوڑتے ہوئے جواب دیا: ”ہاں! میں عرب ہوں! ایک مدت سے ہم عربوں کے جہاز کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ کیا مال لائے ہیں؟“

ایک عرب لڑکی کو اس لباس میں دیکھنا ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پوچھا: ”میں پوچھتی ہوں آپ کیا مال لائے ہیں؟ آپ حیران کیوں ہیں؟ کیا عرب عورتیں تیرنا نہیں جانتیں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اچھا میں خود دیکھ لیتی ہوں۔“

ابوالحسن نے کہا: ”مٹھرو! ہم گھوڑے لائے ہیں۔ میں تمہیں خود دکھاتا ہوں لیکن میں حیران ہوں کہ اس جزیرے کے عرب ابھی تک زمانہ جاہلیت کے عربوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا انھیں سالوں کا سالباس پہننا اور مردوں سے حیا کرنا کسی نے نہیں سکھایا؟“

لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے جواب دیا: ”کیا یہ سالوں کا

لباس نہیں؟“

”نہیں! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے گھرتک اسلام کی روشنی ابھی تک نہیں آئی۔“ یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک جبہ اٹھایا اور لڑکی کے کندھوں پر ڈال کر بولا: ”اب تم ہمارا جہاز دیکھ سکتی ہو۔“

لڑکی نے ابوالحسن کے الفاظ سے زیادہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اپنے عریاں بازوؤں اور پنڈلیوں کو جتنے میں چھپا لیا۔

ابوالحسن کی پونجی پچاس عربی گھوڑے تھے۔ لڑکی نے یکے بعد دیگرے تمام گھوڑوں کا معائنہ کیا اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولی: ”میں یہ خریدوں گی۔ اس کی قیمت کیا ہے؟“

ابوالحسن نے کہا: ”تم میں ابھی تک عربوں کی ایک خصوصیت باقی ہے یہی گھوڑا ان سب میں بہترین ہے لیکن تم نہ اس کی قیمت ادا کر سکو گی اور نہ یہ عورتوں کی سواری کے قابل ہے۔ یہ جس قدر خوبصورت اور تیز رفتار ہے، اسی قدر منہ زور بھی ہے۔“ لڑکی اس جواب پر مسکرائی اور بولی: ”خیر دیکھا جائے گا، آپ نے جہاز اتنی دُور کیوں ٹھہرا لیا؟“

ابوالحسن نے جواب دیا: ”میں اس ملک کی حکومت سے اجازت لینا ضروری خیال کرتا ہوں۔“

لڑکی نے کہا: ”سرانديپ کا راجہ ایک مدت سے عربوں کے جہاز کا انتظار کر رہا ہے۔ جہاز کنارے پر لے چلیے! لیجیے راجہ کے امیر البحر خود ہی پہنچ گئے۔“

دلیپ سنگھ عبد الشمس سے گہرے تعلقات کی بدولت عربی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر چکا تھا۔ اس نے جہاز پر چڑھتے ہی عربی زبان میں کہا: ”آپ نے جہاز اتنی دُور کیوں ٹھہرا لیا؟“

ادا نہیں کر سکیں گے۔“

ابوالحسن نے دیکھا۔ وہی لڑکی جسے اس نے جہاز پر دیکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے ہاتھ میں چابک لیے کھڑی تھی لیکن اس دفعہ اس کا لباس عرب عورتوں کا سا تھا۔

ابوالحسن نے قدرے خفیف ہو کر کہا۔ ”اگر مجھ پر اعتبار نہیں آتا تو تم خود دیکھ لو، اگر تم اسے لگام بھی دے سکو تو یہی گھوڑا تمہارا انعام ہو گا!“

لڑکی تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی اصطبل کی طرف بڑھی۔ باقی سب لوگ بھی اس طرف چل دیے۔ لڑکی تمام گھوڑوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سفید گھوڑے کی طرف بڑھی، گھوڑے نے اسے دیکھتے ہی چارہ چھوڑ کر کان کھڑے کر لیے لڑکی نے گھوڑے کو تھپکی دی اور وہ کچلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر دوسرے گھوڑے رستے تڑانے لگے۔

ابوالحسن نے کہا۔ ”ٹھہرو!“ اور آگے بڑھ کر گھوڑے کا دستہ کھول کر باہر لے آیا اور اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر کہنے لگا۔ ”اب آپ ہمت آدائی کر سکتی ہیں۔“

لڑکی نے اچانک آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے گھوڑے کا نچلا جبر ا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے زخمی درندے کی طرح تڑپتے، اچھلتے اور کودتے ہوئے جانور کے منہ میں لگام ٹھونس دی۔ تماشائیوں نے حیرانی پر قابو نہ پایا تھا کہ اس نے دستہ کھولا اور گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ گھوڑا چند بار سیخ پا ہونے کے بعد چھلانگیں لگاتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔

شیخ عبدالشمس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”عرب کی گھوڑیوں نے ایسا گھوڑا پیدا نہیں کیا جس پر سلی سوار نہ کر سکتی ہو، مجھے افسوس ہے کہ آپ شرط

ابوالحسن کی بجائے لڑکی نے جواب دیا۔ ”ان کا خیال تھا کہ شاید جہاز کو بند گاہ پر لگانے سے پہلے راجہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہو!“

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ وہ سفید گھوڑا میرا ہے اور میں اس کے منہ مانگے دام دوں گی۔“ یہ کہہ کر لڑکی نے جبہ اتار کر ایک عرب کے کندھوں پر پھینک دیا اور بھاگ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

(۳)

عبدالشمس کو عربوں کے جہاز کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے شہر کے چند معززین کے ساتھ ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کیا، انھیں اپنے گھر اور ان کے گھوڑوں کو اپنے اصطبل میں جلد دی۔ آن کی آن میں پچاس گھوڑوں کے کوئی دو سو خریدار جمع ہو گئے اور تمام ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دینے لگے۔ دلیپ سنگھ نے مشورہ دیا کہ راجہ کو دکھائے بغیر کوئی گھوڑا فروخت نہ کیا جائے، ممکن ہے وہ تمام گھوڑے خرید لیں۔ عبدالشمس نے دلیپ سنگھ کی تائید کی۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ راجہ کا ایلچی آیا اور اس نے کہا۔ ”مہاراج عرب تاجروں سے ملنا اور ان کے گھوڑے دیکھنا چاہتے ہیں۔“

دلیپ سنگھ نے ایلچی سے کہا۔ ”تم جاؤ اور مہاراج سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔“ یہ کہہ کر ابوالحسن سے مخاطب ہوا۔ ”ایک گھوڑا شیخ عبدالشمس کی بیٹی نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہیں رہنے دیا جائے۔“

ابوالحسن نے کہا۔ ”اگر شیخ خود اپنے لیے لینا چاہتے ہیں تو مجھے عذر نہیں لیکن وہ لڑکیوں کی سواری کے قابل نہیں۔ وہ بہت سرکش ہے!“

ایک طرف سے آواز آئی۔ ”نہیں بابا جی! ان کا خیال ہے کہ ہم اس کی قیمت

ہار گئے لیکن اطمینان رکھیے کہ آپ کو اس کی پوری قیمت ادا کی جائے گی۔“
ابوالحسن نے جواب دیا۔ ”یہ شرط نہ تھی انعام تھا اور انعام کی قیمت نہیں
لی جاتی۔ خوش قسمت ہے وہ گھوڑا جسے ایسا سوار مل جائے۔“

(۴)

راجہ دیکھنے سے پہلے ہی تمام گھوڑوں کو خریدنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شاہی
خزانے سے جو قیمت ادا کی گئی، وہ عربوں کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ راجہ نے
ابوالحسن سے عربوں کے نئے دین اور ان کی فتوحات کے متعلق کئی سوالات کیے۔
دلیپ سنگھ نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔ ابوالحسن نے تمام سوالات کا جواب
دینے کے بعد دین اسلام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ راجہ نے اسلام کی بہت سی
خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد ابوالحسن سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر
اُسے رخصت کیا۔

جب ابوالحسن اپنے میزبان کے گھر واپس پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ سلمیٰ ابھی
تک واپس نہیں آئی اور عبدالشمس چند آدمیوں کے ہمراہ اس کی تلاش میں جا چکا
ہے۔ ابوالحسن نماز ظہر ادا کرنے کے بعد پریشانی کی حالت میں مکان کے صحن میں
ٹہل رہا تھا کہ سفید گھوڑا بے تحاشا بھاگتا ہوا اندر آیا۔ گھوڑے کی لگام بھی غائب تھی۔
ابوالحسن نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”خدا معلوم اُسے کیا ہوا۔“
یہ گھوڑا سرکش ضرور ہے لیکن گرے ہوئے سوار کو چھوڑ کر آنے والا نہیں اور لگام
پاؤں کے نیچے آکر ٹوٹ سکتی تھی، لیکن اس کا گر پڑنا ممکن نہ تھا میں جلتا
ہوں۔“

ابوالحسن نے شیخ عبدالشمس کے خادم سے دوسری لگام منگوا کر گھوڑے
کو زہی اور ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر مکان سے باہر نکلا اور گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ

دیا۔ گھوڑے کی رفتار ظاہر کرتی تھی کہ اس سے بہت زیادہ کام لیا جا چکا ہے۔ گھوڑا
چند کوس گھنے جنگل میں سے گزرنے کے بعد ایک ٹیلے پر چڑھا اور ایک آبشار کے
قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے اوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر
دیکھنے کے بعد ابوالحسن گھوڑے سے اُترا اور اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر
سلمیٰ کو آوازیں دینے لگا۔ دیر تک تلاش کرنے کے بعد وہ تھک کر آبشار کے قریب
ایک پتھر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ شام ہونے کو تھی۔ ابوالحسن نے عصر کی نماز ادا کی اور پھر
ایک دشوار گزار راستے سے اس مقام تک پہنچا، جہاں بے پناہی ندی کا پانی ایک آبشار
کی شکل میں نیچے گرتا تھا۔ سلمیٰ چند قدم کے فاصلے پر ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے
بیٹھی ہوئی تھی۔ ابوالحسن کی نظر اُس پر اُس وقت پڑی جب ایک تین چار گز لمبا اور آدمی
کی ران کے برابر موٹا اڑدھا گھاس میں سے سرکتا ہوا اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ابوالحسن
”سلمیٰ! سلمیٰ!“ کہتا ہوا بھاگا اور اُس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چند قدم دور لے گیا۔
سلمیٰ نے، ملکی سی چیخ کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔ اڑدھا شکار کو جاتا ہوا دیکھ کر پھنکارتا
ہوا لپکا۔ اتنی دیر میں ابوالحسن نیام سے تلوار نکال چکا تھا۔ اڑدھے نے اس کے بالکل قریب
پہنچ کر گردن بلند کی۔ ابوالحسن نے ایک طرف کود کر دار کیا، اڑدھے کا سر کٹ کر علیحدہ
ہو گیا۔ ابوالحسن نے ندی کے پانی سے تلوار صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت ہی وقوف
ہو! سونے کی یہ کون سی جگہ تھی؟“

سلمیٰ ابھی تک دہشت زدہ ہو کر کانپ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں تھک کر یہاں
بیٹھ گئی تھی اور اونگھتے اونگھتے نہ جانے کس وقت لیٹ کر سو گئی۔ میں یہاں کئی بار اچکی
ہوں لیکن ایسا اڑدھا کبھی نہیں دیکھا۔ آپ پہنچ گئے، ورنہ یہ اڑدھا اس طرح ترپنے کی بجائے
مجھے نکل رہا ہوتا۔ آپ یہاں کیسے پہنچے؟“

”تم جانتی ہو میں یہاں کیسے پہنچا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں پہنچ کر گھوڑا کیوں چھوڑ

سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے کب چھوڑا۔ وہ مجھے گرا کر بھاگ گیا تھا۔“
ابوالحسن نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری تربیت بہت ناقص ماحول میں ہوئی ہے۔ اس لیے تمہارے اخلاق کا معیار وہی ہونا چاہیے جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کا تھا لیکن وہ بھی ہزار بڑائیوں کے باوجود مہمان سے جھوٹ بولنا ایک گھناؤنا فعل خیال کرتے تھے اور اس گھوٹے کو خالی واپس آنا دیکھ کر مجھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ تمہیں گرا کر بھاگ آیا ہے۔ اس کی تربیت میرے اصطبل میں ہوئی ہے۔ یہ سرکش اور مغرور ضرور ہے لیکن دھوکا دینا نہیں جانتا۔ سچ بتاؤ! تم نے اپنے ہاتھوں سے اس کی لگام نہیں اتاری اور اسے ڈرا دھمکا کر واپس نہیں بھیجا؟“

سلمیٰ نے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر آپ بڑا مانتے ہیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گی۔“

”تم میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں میں بُرا سمجھتا ہوں۔ جنہیں ہر مسلمان بُرا جانے گا۔“

”آپ چاہیں تو میں ہر عادت بدلنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کی خوشنودی میرا فرض ہے اور آپ نے تو آج میری جان بھی بچائی ہے۔“

”تمہیں مجھے خوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں تمہارا خدا تم پر ہو۔ تمہیں صرف وہ چیز پسند کرنی چاہیے جو اُسے پسند ہو اور ہر اس چیز کو ناپسند کرنا چاہیے جو اُسے ناپسند ہو۔ خدا کو عورتوں کا نیم عریاں لباس میں مردوں کے سامنے جانا پسند نہیں۔“

سلمیٰ نے جواب دیا۔ ”لباس تو میں نے آپ کے کہنے سے تبدیل کر لیا تھا؟“
ابوالحسن نے کہا۔ ”لباس سے زیادہ دل کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ خیر اربابوں کا وقت نہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ تمہارے والد بہت پریشان ہونگے۔ وہ گھوٹے کے

پہنچنے سے پہلے ہی تمہاری تلاش میں نکل گئے تھے۔

چاندنی رات میں ابوالحسن اور سلمیٰ جنگل کو عبور کر رہے تھے۔ سلمیٰ گھوڑے پر سوار تھی۔ ابوالحسن باگ تھاڑے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں سلمیٰ نے ابوالحسن کے بحری سفر، اس کے خاندان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق سوالات کیے لیکن اس کی توقع کے خلاف ابوالحسن کی بے اعتنائی بڑھتی گئی۔ سلمیٰ پریشان بھی تھی اور نادام بھی، بالآخر اس نے کہا۔ ”آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی، میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ مجھے سزا دے لیں لیکن خفانہ ہوں، یہ میرا قصور تھا اور مجھے پیدل چلنا چاہیے تھا۔ میں اتر آتی ہوں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔“

اس دفعہ بھی اس کی توقع کے خلاف ابوالحسن نے سر دھری سے جواب دیا۔ ”اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ تم ایک عورت ہو اور کوئی درندہ تمہیں کھا جائے گا تو میں یقیناً اس وقت تمہارے ساتھ چلنا گوارا نہ کرتا۔“

سلمیٰ شکست خوردہ سی ہو کر تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ”اگر وہ اثر دیا مجھے نکل جاتا تو آپ کو اس بات کا افسوس ہوتا؟“

”یہ صرف تمہارے لیے ہی نہیں۔ میرے سامنے اگر وہ کسی کو بھی ہلاک کرتا تو مجھے اسی قدر افسوس ہوتا؟“

”آپ نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟“

”ایک انسان کی جان بچانا مسلمان کا فرض ہے۔“

سلمیٰ دیر تک خاموش رہی۔ دُور سے چند گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور ابوالحسن نے کہا۔ ”دیکھو! وہ ابھی تک تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں!“

تھوڑی دیر بعد عبدالشمس اور اس کے ساتھی پہنچ گئے۔ بیٹی کو سلامت دیکھ کر عبدالشمس نے واقعات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سلمیٰ کی زبانی اڑھے

کے متعلق سن کر اس نے ابوالحسن کا شکریہ ادا کیا :
(۵)

اگلے روز علی الصباح عبد الشمس اپنے مکان کی پھت پر نیم خوابی کی حالت میں لیٹے لیٹے اذان کی دلکش آواز سن رہا تھا۔ کچھ دیر انگڑائیاں لینے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ سلمیٰ ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ عبد الشمس اسے جگا کر صبح کی ہوا خوری کے ارادے سے نیچے اتر آیا۔

ابوالحسن کے ساتھ شبنم آلود گھاس پر چادرین بچھا کر اس کے پیچھے صاف بستہ کھڑے تھے۔ ابوالحسن نے نہایت دلکش آواز میں سورۃ فاتحہ کے بعد چند آیات تلاوت کیں۔ قرآن مجید کے الفاظ نے عبد الشمس کے دل میں تلاطم برپا کر دیا۔ اس کے پڑوسی عرب بھی اس کے قریب آکھڑے ہوئے اور اپنی قوم کے نوجوانوں کے نئے طریق عبادت کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ رکوع و سجود کے بعد دوسری رکعت تک عبد الشمس پر ایک بے خودی سنی طاری ہو چکی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ نمازیوں کی طرف چندم اٹھائے قریب پہنچ کر جھکا، رکاو اور جذبات کے ہیجان کی کسی رو کے ماتحت بھاگتا ہوا صاف میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔ نماز کے اختتام پر ابوالحسن نے اٹھ کر عبد الشمس کو گلے لگا لیا۔ عبد الشمس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھپک رہے تھے۔ ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں نے انھیں مبارک باد دی۔

عبد الشمس نے کہا: ”آپ کی زبان میں ایک جادو تھا۔ مجھے کچھ اور سنائیے“
ابوالحسن نے جواب دیا: ”یہ میری آواز نہ تھی۔ یہ خدا کا کلام تھا۔“

عبد الشمس نے کہا: ”بے شک یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ سنائیے مجھے!“
ابوالحسن نے اپنے ایک ساتھی طلحہ کی طرف اشارہ کیا۔ طلحہ قرآن کا حافظ تھا۔ عرب اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ طلحہ نے سورۃ یسین کی تلاوت کی۔ قرآن مجید کے مقدس

الفاظ اور طلحہ کی دل گداز آواز سے عبد الشمس اور اس کے ساتھیوں پر رقت طاری ہو گئی۔ تلاوت کے بعد ابوالحسن نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ عبد الشمس اور اس کے ساتھی جو ایک مدت سے عربوں کی عظمت کی داستانیں سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اعتراف کر چکے تھے۔ ابوالحسن کی تبلیغ کے بعد دین اسلام کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ کلمہ توحید پڑھنے کے بعد عبد الشمس نے اپنے لیے عبد اللہ کا نام پسند کیا۔

سلمیٰ ناریل کے ایک درخت کا سہارا لیے کھڑی یہ تمام واقعات دیکھ رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے باپ سے کہنے لگی۔

”اباجان! کیا عورتیں بھی مسلمان ہو سکتی ہیں؟“

عبد اللہ نے مسکراتے ہوئے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور وہ بولا: ”خدا کی رحمت عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں ہے۔“

سلمیٰ نے کہا: ”تو میرا نام بھی تبدیل کر دیجیے! میں بھی مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔“
ابوالحسن نے کہا: ”تمہارا یہی نام ٹھیک ہے۔ تم فقط کلمہ پڑھ لو!“

سلمیٰ نے کلمہ پڑھا اور سب نے ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعا کی۔

آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگی اور یہ لوگ ایک کمرے میں چلے آئے۔

تھوڑی دیر بعد بارش ختم گئی اور دلیپ سنگھ نے آکر خبر دی کہ ہمارا آج آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

ابوالحسن اپنے ساتھیوں کو وہیں پھوڑ کر دلیپ سنگھ کے ساتھ ہو لیا۔

(۴)

دوپہر کے وقت ابوالحسن واپس آیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ راجہ اور بعض سرداروں نے اور بھی عربی گھوڑے خریدنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ہمارا جہاز چوتھے روز واپس روانہ ہو جائے گا۔“

عبداللہ (عبدالشمس) نے انھیں کچھ دن اور ٹھہرنے کے لیے کہا لیکن ابوالحسن نے جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے اجازت حاصل کر لی۔“

عبداللہ نے کہا: ”ابھی ہمیں اسلام کے متعلق بہت کچھ جانا ہے۔ اگر آپ طلحہ کو یہاں چھوڑ جائیں تو بہت اچھا ہو گا۔“

ابوالحسن نے طلحہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: ”اگر یہ پسند کریں تو میں انھیں بخوشی یہاں چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔“

طلحہ نے یہ دعوت خوشی سے قبول کر لی۔

اگلے دن ابوالحسن کے ساتھی جہاز کے بادبانوں کی مرمت اور خورد و نوش کا ضروری سامان خریدنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ دلیپ سنگھ اور عبداللہ نے مشورہ کرنے کے بعد ابوالحسن نے اپنے تمام سرمائے سے آٹھ ہاتھی اور باقی جہاز ناریل سے بھر لیا۔

شام کے وقت ابوالحسن عبداللہ کے باغچے میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو سلمیٰ کھڑی تھی۔ وہ چہرہ جو دو دن پہلے مسرتوں کا گوارہ تھا۔ اب حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں جو اندھیری ذات کے ستاروں سے زیادہ دلفریب اور چمکیلی تھیں، اب پُر نم تھیں۔

اس نے قدرے بے اعتنائی سے پوچھا: ”سلمیٰ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

ابوالحسن کا روکھا پن دیکھ کر ضبط کی کوشش کے باوجود اس کے آنسو جھک

پڑے۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی: ”آپ پرسوں جارہے ہیں؟“

”ہاں! لیکن تمھیں کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟“

”کچھ نہیں! کچھ بھی تو نہیں!!“

آنسوؤں میں جھگی ہوئی مسکراہٹ ابوالحسن کے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہی۔ اس نے کہا: ”سلمیٰ! تم ابھی تک وہی ہو۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود میں تم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتا۔ تمھیں اب نا محرموں کے سامنے آنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک مسلمان لڑکی کا سب سے بڑا زیور حیا ہے۔“

”آپ اب تک مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے کہنے پر میں لباس تبدیل کر چکی ہوں، نماز پڑھ چکی ہوں۔ پرسوں سے میں نے گھر کے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں ایک مسلمان کے سامنے بھی نہ آؤں؟“

”ہاں! یہ بھی ضروری ہے۔ میں طلحہ کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ تمھیں ایک مسلمان عورت کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ تمھیں اسلام کی صحیح تعلیم دے گا۔“

سلمیٰ نے جواب دیا: ”مجھے کسی اور تعلیم کی ضرورت نہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، میں مانوں گی۔ آپ کے اشارے پر میں پہاڑ پر سے کودنے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر سمندر میں پھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوں۔“

ابوالحسن نے کہا: ”سلمیٰ! اگر تمھیں میری خوشی اس قدر عزیز ہے تو سنو! میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ تم سر سے پاؤں تک اسلام کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ سچے مسلمان کی ہر نیت اور ہر فعل کو کسی انسان کی خوشی نہیں بلکہ خدا کی خوشی کا طبقہ ہونا چاہیے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد تم ایک ایسی دنیا میں پاؤں رکھ چکی ہو، جو ایک انتہائی جدوجہد کا گھر ہے اس میدان میں کودنے والے کے دل میں آنسوؤں اور آہوں کے لیے

کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے مسلمان کے لیے زندگی ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ اس کے پہلو میں وہ دل ہونا چاہیے جو خدا کی راہ میں زندگی کی بلند ترین خواہشات کو بھی قربان کرنے سے نہ گھبرائے۔ اس کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو لیکن زبان سے آہ تک نہ نکلے۔ تم عرب جاؤ تو شاید یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ مسلمان عورتیں اپنے شوہروں بھائیوں اور بیٹوں کو جہاد پر رخصت کرتی ہیں لیکن ان کی آنکھ میں آنسو تو درکنار پیشانی پر شکن تک نہیں آتی اور یہ صرف اس لیے کہ وہ خدا کی خوشی کو دنیا کی ہر خوشی پر ترجیح دیتی ہیں۔ اگر تم نے مجھے خوش کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ تم اسلام کو سمجھی نہیں۔ اگر خدا کو خوش کرنا چاہتی ہو تو گھر جاؤ میں طلحہ کو بھیجتا ہوں، وہ آج ہی تمہیں قرآن پڑھانا شروع کر دے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں تو تم میری پیرا کی کا امتحان لینے کے لیے ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر سمندر میں میرا استقبال نہ کرو اور مجھے جنگلوں اور پہاڑوں میں تمہیں تلاش نہ کرنا پڑے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ عبد الشمس کا نام تبدیل ہونے کے بعد اس کے گھر کا نقشہ بھی بدل چکا ہے اور اس چار دیواری میں ایک مسلمان لڑکی پرورش پا رہی ہے۔“

سلمیٰ نے پر امید ہو کر پوچھا: ”آپ کب آئیں گے؟“

”میں دن معین نہیں کر سکتا لیکن ارادہ یہی ہے کہ گھوڑے خریدتے ہی وہاں سے واپس آ جاؤں لیکن اگر مجھے جہاد کے لیے کہیں جانا پڑا تو ممکن ہے کہ دوبارہ نہ آ سکوں۔“ سلمیٰ کے چہرے پر پھر ایک بار اُداسی چھا گئی اور اس نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا: ”نہیں، یوں نہ کیجئے! خدا آپ کو واپس ضرور لائے گا۔“

”تم دعا کرتی رہو گی تو انشاء اللہ میں ضرور آؤں گا۔“

سلمیٰ نے کہا: ”دعا؟ آپ کیا کہتے ہیں اگر میری دعا قبول ہو سکتی تو آپ جانے

کا ارادہ کیوں کرتے؟“

ابو الحسن نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کر چکا ہے۔ اس نے لہجے کو ذرا ترش بناتے ہوئے کہا: ”سلمیٰ جاؤ! اگر عرب کی تمام عورتیں تمہارے جیسی نیک دُعائیں کرتیں تو اسلام کی روشنی عرب کی حدود سے باہر نہ نکلتی۔“

سلمیٰ نادم سی ہو کر واپس ہوئی، بار بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ ”میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے یہ کیوں کہا۔“

مقوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھی۔ اُفتی مغرب پر گرم لوہے کے سُرخ تھال کی طرح چمکتا ہوا سورج پانی میں غوطہ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل شفق کی سُرخ کی عکاسی کر رہے تھے۔ مرطوب ہوا کے جھونکے ناریل کے پتوں پر ایک دلکش راگ چھیڑ رہے تھے۔ ارد گرد کے تمام مناظر سے ہٹ کر سلمیٰ کی نگاہیں سمندر کے کنارے عربوں کے جہاز پر مرکوز ہو گئیں۔ دل میں ہیجان بسپا ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی: ”اے خشکی اور تری کے مالک! مجھے ایک مسلمان عورت کا ایمان دے۔ مجھے سیدھی راہ دکھا اور جب وہ واپس آئیں تو مجھے دیکھ کر خفا نہ ہوں۔“

(ک)

تیسرے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ سلمیٰ کوٹھے پر چڑھ کر حسرت بھری نگاہوں سے سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساحل سے دور ابو الحسن کا جہاز موجوں پر رقص کرتا نظر آ رہا تھا۔ ہوا کے چند تیز جھونکے آئے اور بارش ہونے لگی۔ بارش کی تیزی کے ساتھ اس کی نگاہوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جہاز آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ضبط کی کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو پھلک پڑے اور رخساروں پر بہتے ہوئے بارش کے قطروں کے ساتھ مل گئے۔ سلمیٰ دیر تک ہاتھ اٹھا کر یہ دعا دہراتی رہی: ”میسے مولیٰ! اے سمندر کی سرکش لہروں سے محفوظ رکھیو!“

غیچے میں ابو الحسن سے آخری ملاقات کے بعد سلمیٰ کے خیالات اور عادات میں

وانہو بنیاء جہاز اُسے دور سے ابوالحسن کی آمد کا پیغام دیتا۔ وہ اپنے خادم کو دن میں کئی کئی بار بندرگاہ کی طرف بھیجتی۔ جب وہ مایوس نگاہوں کے ساتھ واپس آتا تو وہ بے قرار سی ہو کر پوچھتی: ”تم نے اچھی طرح دیکھا۔ ممکن ہے ان میں کوئی عرب بھی ہو؟“
 خادم جواب دیتا: ”وہ فلاں جگہ سے آیا ہے۔ میں پوری طرح چھان بین کر کے آیا ہوں ان میں ایک بھی عرب نہ تھا۔“

وہ امید و بیم کے سمندر میں غوطے کھانے والے انسان کی طرح تنکوں کا سہارا لیتی اور کہتی: ”تم نے ملاخوں سے پوچھا ہوتا۔ ممکن ہے انھوں نے راستے میں کسی بندرگاہ پر عربوں کا جہاز دیکھا ہو یا ان کے متعلق سنا ہو؟“

خادم پھر بھاگتا ہوا بندرگاہ جاتا۔ سلمیٰ کی اُمیگیں پُرانی اُمیدوں کے کھنڈروں پر نئی اُمیدوں کا محل کھڑا کر لیتیں۔ بوڑھے نوکر کا افسردہ اور ملول چہرہ پھر وہی حوصلہ شکن خبر دیتا اور سلمیٰ کی اُمیدوں کا محل دھڑام سے نیچے آ رہتا۔ ہر صبح وہ اپنے دل میں امید کے چراغ روشن کرتی۔ جب سورج سمندر کی لہروں میں چھپ جاتا تو یہ چراغ بھی بجھ جاتے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں آہوں اور آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتیں۔

بَدّت تک طلحہ یا اپنے باپ میں سے کسی پر اس نے اپنے دل کا حال ظاہر نہ ہونے دیا لیکن ایک شام سلمیٰ کے طرزِ عمل نے ان دونوں کو شبہ میں ڈال دیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، طلحہ اور عبداللہ برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سلمیٰ ایک کمرے کے درپچے کے سامنے بارش کا منظر دیکھ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ابوالحسن کا ذکر آگیا۔ عبداللہ نے کہا: ”خدا جانے وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔ آٹھ مہینے ہو گئے ہیں۔“
 طلحہ نے کہا: ”اگر خدا نے اُسے سمندر کے حوادث سے محفوظ رکھا ہو تو اتنی دیر تک اس کے واپس نہ آنے کی وجہ ہی ہے کہ وہ کہیں جہاد پر چلا گیا ہے۔“
 عبداللہ نے کہا: ”آج مجھے دلپسند سنگھ نے بتایا ہے کہ یہاں سے کوئی تیس میل

بہت بڑی تسبیہ لٹی اچھکی تھی۔ اُسے ابوالحسن کی بے اعتنائی کا بے حد ملال تھا۔ تاہم اُسے انسانیت کا بلند ترین معیار تصور کرتے ہوئے وہ اس بات پر ایمان لائے تھے کہ اس کی جو عادت ابوالحسن کو ناپسند ہے۔ یقیناً بُری ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوبارہ کسی کے سامنے بے حجاب ہونے کی جرأت نہ کی۔

جب ابوالحسن اور اس کے ساتھی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے تو اس نے اپنے دل سے یہ سوال کیا: ”کیا اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہو سکتی ہے؟“ ابوالحسن کی باتیں یاد آتیں تو اس کے دل میں کبھی یا حسن کی تاریکیاں مسلط ہو جاتیں اور کبھی اُمید کے چراغ چمک اُٹھتے۔

عبداللہ کی آواز سُن کر وہ نیچے اتری۔ بوڑھے باپ نے سوال کیا: ”سلمیٰ! تم بارش میں اوپر کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ نہیں آجی! میں.....“ سلمیٰ کوئی بہانہ کرنا چاہتی تھی لیکن اُسے ابوالحسن کی نصیحت یاد آگئی اور وہ بولی: ”میں ان کا جہاز دیکھ رہی تھی۔“

عبداللہ نے کہا: ”وہ تو دیر ہوئی جا چکے۔ جاؤ تم کپڑے بدل آؤ! طلحہ ابھی آجائے گا۔ ہم اس سے قرآن مجید پڑھیں گے۔“

سلمیٰ نے پوچھا: ”آپ انھیں کہاں چھوڑ آئے؟“
 ”وہ راستے میں زید کے گھر ٹھہر گیا تھا۔ ابھی آجائے گا۔“

چند دنوں میں طلحہ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلمیٰ اپنی ہر بات میں ابوالحسن کی خوشی کو مقدم سمجھنے کی بجائے خدا کی رضا کو مقدم سمجھنے لگی۔ تاہم ہر نماز کے بعد اس کی سب سے پہلی دعا ابوالحسن کے لیے ہوتی تھی۔

چھ مہینے گزر گئے ابوالحسن کی کوئی خبر نہ آئی۔ سلمیٰ کی اُداسی بے چینی میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ صبح و شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھتی۔ بندرگاہ کی طرف آنے

کے فاصلے پر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو چکا ہے۔ صرف ایک کشتی پانچ آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچی ہے۔

طلحہ نے پوچھا: ”اس پر کتنے آدمی تھے؟“

”شاید بیس تھے۔ جہاز بہت بڑا تھا اور اس پر تجارت کا بہت سامان تھا۔“

”جہاز کیسے غرق ہوا؟“

”ملاح منزل کو قریب دیکھ کر بے پرواہ ہو گئے اور جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔“

سلمیٰ پاس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے خیالات میں محو تھی۔ اس نے فقط آخری فقرہ سنا اور ایک ثانیہ کے لیے اس کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

برآمدے سے پھر عبد اللہ کی آواز آئی: ”یہ چٹانیں بہت خطرناک ہیں۔ ہر سال ان کی وجہ سے کوئی نہ کوئی جہاز غرق ہو جاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ یہ چٹانیں سمندر کے دیوتا کے مندر ہیں۔“

یہ سنتے ہی سلمیٰ کی رگوں میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے سے نکل کر باپ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کا دہشت زدہ چہرہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر باپ نے پوچھا: ”بیٹی! تمہیں کیا ہوا؟“

کچھ دیر جذبات کی شدت کی وجہ سے سلمیٰ کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ رنج و کرب کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں: ”جو کچھ تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو میں سچی ہوں۔“

طلحہ نے حیران ہو کر پوچھا: ”کیوں بیٹی کیا بات ہے؟“

سلمیٰ کے بچنے ہوئے ہونٹ کپکپائے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں پر آنسوؤں کے بادبیک پر دے چھا گئے۔ اس نے کہا: ”بتائیے! کب ڈوبائے گا جہاز؟“ آپ کو

کس نے بتایا؟ اور وہ.....! آپ خاموش کیوں ہیں؟ خدا کے لیے کچھ کہیے! میں بُری سے بُری خبر سننے کے لیے تیار ہوں۔“ بچکیوں اور آنہوں کی شدت اس کی آواز کے تسلسل کو توڑ رہی تھی۔

عبد اللہ نے پریشان سا ہو کر جواب دیا: ”بیٹی! ہم مالابار کے ایک جہاز کا ذکر کر رہے تھے۔ آج دلیپ نے مجھے بتایا تھا۔“

لیکن سلمیٰ نے باپ کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا: ”نہیں! نہیں! آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دیں! یہ کہہ کر سلمیٰ بچکیاں لیتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بوڑھے باپ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ وہ طلحہ کی طرف معذرت طلب نگاہوں سے دیکھتا ہوا اٹھا اور سلمیٰ کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ منہ کے بل بستر پر لیٹی بچکیاں لے رہی تھی۔ بوڑھے باپ کا دل بھرا آیا اور اس نے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا: ”بیٹی کیا ہو گیا تمہیں؟“

سلمیٰ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھے اور بچکیاں ضبط کرتے ہوئے جواب دیا: ”کچھ نہیں! اباجان! مجھے معاف کیجیے! آئندہ آپ مجھے کبھی روتے نہیں دیکھیں گے۔“

”لیکن روتے کی کوئی وجہ بھی تو ہو؟ ایسی خبریں تو ہم روز سنا کرتے ہیں۔ آخر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو جانے کی خبریں کیا خصوصیت تھی؟“

سلمیٰ نے غور سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر بولی: ”آپ سچ کہتے ہیں؟“

عبد اللہ نے برہم ہو کر کہا: ”آخر مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ آج تک تم نے میری کسی بات پر شک نہیں کیا۔ اگر مجھ پر یقین نہیں آتا تو طلحہ سے پوچھ لو! سلمیٰ نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کہا: ”اباجان! میں معذرت چاہتی ہوں۔“

داخل ہوا۔

ابوالحسن نے کہا: ”اوہو تم! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میری وجہ سے تمہیں بارش میں بھیگنا پڑا۔“

سلمیٰ نے اپنے دل میں کہا: ”کاش تم یہ جان سکتے کہ اس بارش کی بوندیں کس قدر خوش گوار ہیں۔“ اور پھر ابوالحسن سے مخاطب ہو کر بولی: ”چلیے!“

برآمدے میں طلحہ اور عبد اللہ ابوالحسن کی آواز سُن کر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ عبد اللہ نے آواز دی:۔

”کون! ابوالحسن!“

ابوالحسن نے برآمدے کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا: ”جی ہاں! میں ہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے خواہ مخواہ اس وقت آپ کو تکلیف دی۔“

طلحہ نے پوچھا: ”کیسے خیریت تو ہے نا! آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟“

”ہاں! خیریت ہے۔ میں ان سب کو جہاز پر چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے اتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ راستے میں ایک دفعہ پھسلا دو مرتبہ ندی میں گرا، پانچ مکانات کو آپ کا مکان سمجھ کر آوازیں دیں۔ ایک گھر کے چند فرض شناس کتوں نے میرا استقبال کیا۔“

عبد اللہ نے سلمیٰ کو آواز دی: سلمیٰ ابھی بے خودی کے عالم میں برآمدے سے باہر کھڑی تھی۔

آج بھی بارش کے قطرے اس کے رُخساروں کے آئسودھو رہے تھے لیکن یہ خوشی کے آئسودھو تھے۔ باپ کی آواز سُن کر وہ چونکی اور بھاگتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی۔

”کیا ہے ابا جان؟“

”بیٹی جاؤ! ان کے لیے کھانا اور کپڑوں کا جوڑا لے آؤ اور باقی مہمانوں کے لیے

میں سمجھی تھی.... کہ شاید آپ عربوں کے جہاز کا ذکر کر رہے تھے۔“

”بیٹی! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ خدا نخواستہ اگر میں ان کے جہاز کے متعلق ایسی خبر سُننا تو مجھے تم سے کم صدمہ ہوتا؟“

شام کے کھانے کے بعد طلحہ اور عبد اللہ کا خادم عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے۔ خادمہ برتن صاف کر رہی تھی۔ اتنے میں کسی نے باہر کے پھاٹک پر دستک دی، سلمیٰ نے خادمہ سے کہا: ”شاید زید اور قیس آئے ہیں۔ تم نے باہر کا دروازہ بند تو نہیں کر دیا تھا؟“

خادمہ نے جواب دیا: ”ایسی بارش میں کون آسکتا ہے۔ میں ابھی کواڑ بند کر کے آئی ہوں۔ اگر انھیں آنا ہوتا تو مغرب کی نماز کے لیے نہ آتے؟ اور ہاں زید تو بیمار ہے، قیس بے چارہ بوڑھا۔ اس نے گھر ہی پر نماز پڑھ لی ہوگی۔“

”لیکن پھر بھی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔“

”یہ آپ کا وہم ہے۔ دروازہ ہوا سے ہل رہا ہے۔“

”نہیں کسی کی آواز بھی سُن رہی ہوں۔ شاید....! میں جاتی ہوں۔“

سلمیٰ کا دل دھڑک رہا تھا۔ تاریکی میں ایک قدم آگے دیکھنا محال تھا۔ وہ بجلی کی چمک میں درختوں سے بچتی ہوئی پھاٹک تک پہنچی۔

پھاٹک کے باہر کوئی آہٹ نہ پا کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ بایوس ہو کر واپس ہونے کو تھی کہ کسی نے دروازے کو زور سے دھکا دیتے ہوئے آواز دی: ”کوئی ہے؟“

ایک آن کے لیے سلمیٰ کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر وہ لپک کر آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ سلمیٰ کے سامنے ایک بلند قامت انسان کھڑا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی اس نے سوال کیا: ”کیا یہ عبد اللہ کا گھر ہے؟“

پیشتر اس کے کہ سلمیٰ کوئی جواب دیتی بجلی چمکی اور ابوالحسن سلمیٰ کو پہچان کر اندر

بھی کھانا تیار کر ڈاؤ! میں انھیں بلانے کے لیے جاتا ہوں۔“

ابو الحسن نے کہا: ”کھانا ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔“

کپڑے بدلنے کے بعد ابو الحسن، عبداللہ اور طلحہ سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس نے دیر سے واپس آنے کی یہ وجہ بیان کی کہ بصرہ سے اُسے افریقہ ایک مہم میں شریک ہونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

ساتویں دن عبداللہ کی رضا مندی نے سلمیٰ اور ابو الحسن کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

(۸)

تین سال بعد ابو الحسن شہر میں اپنے لیے ایک خوبصورت مکان اور اس کے قریب ایک مسجد تعمیر کروا چکا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے چند ساتھی بھی اس شہر میں آباد ہو گئے۔ پانچ سال کے عرصے میں ابو الحسن اور طلحہ کی تبلیغ سے مقامی باشندوں کے چند گھرانے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور ابو الحسن نے مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کر کے درس و تدریس کے فرائض طلحہ کے سپرد کر دیے۔

عبداللہ کی بدولت اس کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ شادی کے دوسرے سال اس کے ہاں ایک لڑکا اور چوتھے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے کا نام اُس نے خالد اور لڑکی کا نام ناہیدہ رکھا۔ دسویں سال ایک اور لڑکا پیدا ہوا لیکن تین ماہ کی عمر میں والدین کو داغ مفارقت دے گیا۔

جب خالد کی عمر سات اور ناہیدہ کی عمر پانچ برس تھی سلمیٰ کے باپ نے چند دن موسمی بخار میں مبتلا رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

ابو الحسن کو دنیا کی ہر نعمت میسر تھی۔ اس کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ اُسے اپنے بیوی بچوں سے بے انتہا محبت تھی لیکن یہ محبت اُسے گھر کی چار دیواری میں پابند سلاسل نہ رکھ سکی۔ وہ قریباً ہر سال فریضہ حج ادا کرنے کے لیے ایک طویل بحری سفر کی کٹھن منازل طے کرتا۔ پانچ دفعہ اس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ میں جہاد کرنے والی افواج کا ساتھ دیا۔

ہر بار جہاد اور حج سے واپس آنے کے بعد وہ فنونِ حرب اور مذہبی تعلیم میں اپنے بچوں کا امتحان لیتا۔ خالد تیراندازی، شاہسواری، تیغ زنی اور جہاز رانی کی تعلیم میں اپنے باپ کی بہترین توقعات پوری کر رہا تھا۔

ناہیدہ بارہ سال کی عمر تک تیراندازی کے علاوہ سرکش گھوڑوں پر سوار ہونا سیکھ چکی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی طلحہ کو اس کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف تھا۔ راجہ کے ساتھ ابو الحسن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ مہارانی ایک مدت سے سلمیٰ کی سہیلی بن چکی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ پاکی بھیج کر ماں اور بیٹی کو اپنے محل میں بلاتی۔ راجہ کی ناہیدہ سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی کہ خود بھی کبھی کبھی ابو الحسن کے گھر چلی آتی۔

راجہ کی عمر میں خالد سے چار سال بڑا تھا لیکن پھر بھی وہ خالد کو ہر بات میں قابلِ تقلید سمجھتا۔

ایک دن دلیپ سنگھ نے راجہ کے سامنے فنونِ حرب میں خالد کی غیر معمولی استعداد کی تعریف کی۔ راجہ نے پوچھا: ”کیا وہ ہمارے راجہ کا مقابلہ کر سکے گا؟“ دلیپ سنگھ نے جواب دیا: ”ہمارا راجہ ہمارے راجہ نازوں کے پلے ہوئے

ہیں اور وہ ایک سپاہی کا بیٹا ہے۔“
”لیکن وہ بہت چھوٹا ہے۔“

دلپ سنگھ نے جواب دیا: ”مہاراج! اگر عرب مائیں بچپن میں اپنے بچوں کی اس طرح تربیت نہ کرتیں تو آج وہ ادھی دنیا پر قابض نہ ہوتے۔ میں نے سنا ہے کہ عرب مائیں چودہ سال کے بچوں کو میدان جنگ میں بھیج دیتی ہیں۔“

راجہ نے پوچھا: ”خالد کی عمر کیا ہے؟“

”مہاراج! یہی کوئی بارہ سال ہو گی۔“

”آخر ان بچوں میں کیا خوبی ہے۔ جو ہمارے بچوں میں نہیں؟“

دلپ سنگھ نے جواب دیا: ”مہاراج! اگر برا نہ مانیں تو میں عرض کروں۔“

راجہ نے کہا: ”کہو!“

”مہاراج! ہم میں اور ان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہم بے شمار دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کے علاوہ دنیا کی ہر وہ طاقت جو ہمیں خوفزدہ کر سکتی ہے۔ ہماری نگاہوں میں دیوتا کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً ہماری راہ میں اگر کوئی دشوار گزار پہاڑ آجائے تو ہم اپنی قوت تسخیر کے امتحان کی بجائے اُسے دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں لیکن وہ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں اور اس کے سوا دوسرے زمین کی کسی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے سر جھکانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا ایمان ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔“

ابو الحسن نے ایک دن مجھے بتایا تھا کہ جب خالد اُن کا بہت بڑا سپہ سالار شام کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو شام کے گورنر نے اُسے لکھا تھا کہ تم پہاڑ سے ٹکرا رہے ہو۔ تمہارے چالیس ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں میرے پاس اڑھائی لاکھ ایسی فوج ہے جو بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کے سپہ سالار نے لکھا کہ مجھے تمہاری طاقت

سپاہیوں کے دلوں میں جس قدر زندہ رہنے کی آرزو ہے میرے سپاہیوں میں موت

کی تمنا اس سے کہیں زیادہ ہے۔“

راجہ نے کہا: ”دلپ سنگھ! میں یہ چاہتا ہوں کہ راجکمار کی سپاہیانہ تربیت ابو الحسن کو سونپ دی جائے۔ تم اس سے ملو۔ اگر وہ یہ خدمت قبول کرے تو ہم آ ایک معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہیں۔“

دلپ سنگھ کے کہنے پر ابو الحسن نے راجہ کی دعوت خوشی سے قبول کر لی لیکن معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔

دو سال کی تربیت کے بعد ابو الحسن نے راجہ سے کہا: ”اب آپ کا بیٹا فزین پری میں اس ملک کے بہترین فوجیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔“

راجہ نے پوچھا: ”میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تیرا انداز ہی اور شاہسوار می میں خالد کا مقابلہ ہے یا نہیں؟“

ابو الحسن نے جواب دیا: ”خالد نے اس عمر میں تیر و کمان سنبھالا تھا۔ جب آپ کا راجکمار کھلونوں سے دل بہلایا کرتا تھا اور اس عمر میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا سیکھا تھا جس عمر میں راجکمار کو نوکر کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے۔ خالد فطرتاً ایک سپاہی ہے اور راجکمار فطرتاً ایک شہزادہ ہے۔“

”اور راجکمار تیغ زنی میں کیسا ہے؟“

”وہ خالد سے عمر میں بڑا ہے، اس کے بازو بھی اسی قدر مضبوط ہیں۔ میں نے دونوں کا مقابلہ کرا کے نہیں دیکھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خالد کی نسبت زیادہ آسانی سے تلوار گھما سکتا ہے۔“

راجہ نے بیٹے کو بلا کر پوچھا: ”کیوں راجکمار! تم اپنے استاد کے بیٹے سے تلوار کے دو دو ہاتھ دکھانے کے لیے تیار ہو؟“

راجکمار نے جواب دیا: ”نہیں پتاجی! وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر میں ہار گیا

مجھے شرم آئے گی، اور وہ ہار گیا تو بھی مجھے ہی شرم آئے گی۔“

(۹)

ابوالحسن کی شادی کو اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔ خالد کی عمر سولہ اور ناہید کی عمر چودہ برس تھی۔ خلیفہ ولید کی مسند نشینی کے ساتھ مسلمانوں کی نئی فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک دن سندھی تاجروں کا جہاز آیا۔ ان کے ساتھ عمان کا ایک عیسائی بھی تھا۔ سندھ کے تاجروں نے جزیرے کے عربوں سے ترکستان اور شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کا ذکر کیا۔ عمان کے تاجر نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی۔ ابوالحسن اور اس کے چند ساتھی حج کے لیے تیار تھے۔ اب حج کے ارادوں کے ساتھ شوق جہاد بھی شامل ہو گیا۔

راجہ باہر سے آنے والے تاجروں کی زبانی نئے ممالک کی خبریں نہایت دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ مسلمانوں کی تازہ فتوحات کی خبریں سن کر اس نے ابوالحسن کو بلایا اور مسلمانوں کے خلیفہ اور عراق کے گورنر کو سونے اور ہواہرات کے چند تحائف بھیجنے کی خواہش ظاہر کی۔

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ”میں خوشی سے آپ کے تحائف ان کے پاس لے جاؤں گا۔“

سندھ کے تاجروں نے اپنا مال فروخت کیا اور نیا مال خرید کر لوٹ گئے۔ ان کے جانے کے چند دن بعد ابوالحسن اور اس کے ساتھی سفر حج کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سال سرانڈیپ کے نو مسلموں کے علاوہ حج پر جانے والے عربوں کی تعداد بھی خلاف معمول زیادہ تھی۔

طلحہ اور اس کے علاوہ تین اور عرب تاجر حج پر جانے والوں کے گھروں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہ گئے۔ بعض عرب اپنے کم سن بچوں کو طلحہ کی حفاظت میں چھوڑ کر بیویوں کو

ساتھ لے گئے اور بعض اپنے اہل و عیال کو گھروں میں چھوڑ گئے۔

ابوالحسن اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن سفر سے تین دن قبل سلمیٰ اچانک بیمار ہو گئی اور اسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ خالد عقاب کے اس بچے کی طرح جو پر نکلتے کے بعد گھونسے میں پھڑپھڑا رہا ہو، میدانِ عمل میں اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کے لیے بے قرار تھا لیکن ماں کی علالت نے اُسے گھر ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ ابوالحسن نے وعدہ کیا کہ واپس آتے ہی اسے عرب کی سیاحت کے لیے بھیج دے گا۔

رخصت کے دن سلمیٰ کو سخت بخار تھا لیکن وہ انتہائی تکلیف کے باوجود بستر پر نہ لیٹی۔ شوہر کو الوداع کہنے سے پہلے اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”دیکھیے! میں بالکل تندرست ہوں۔ مجھے ساتھ لے چلیے۔ اپنے وعدے نہ بھولیے۔“

ابوالحسن نے مغموم سا ہو کر جواب دیا۔ ”نہیں سلمیٰ! جہاز پر موسمی بخار تمہیں بہت تکلیف دے گا۔ تم تندرست ہو جاؤ گی تو میں دوسرے سفر میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔ دیکھو میں تمہاری تیمارداری کے لیے خالد اور ناہید کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ طلحہ بھی تمہارا خیال رکھے گا۔“

اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں! نہیں! مجھے ضرور لے چلیے! میں آپ کے ساتھ ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں۔“

ابوالحسن نے کہا۔ ”سلمیٰ! ضد نہ کرو۔ دیکھو تمہاری نبض کس قدر تیز ہے۔ بخار سے تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ تم نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ میں جلد واپس آ جاؤں گا۔“

”نہیں! اس دفعہ مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کا سفر بہت لمبا ہے اور میں شاید دیر تک انتظار نہ کر سکوں گی۔“

ابوالحسن نے مغموم صورت بنا کر جواب دیا۔ ”سلمیٰ! تم رورہی ہو کئی برس ہوئے

میں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ مسلمان عورتیں مجاہدوں کو رخصت کرتے وقت آنسو نہیں بہاتیں۔

ان الفاظ نے سلمیٰ پر جاذو کا سا اثر کیا۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”میرے اس درجہ مغموم ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ جا رہے ہیں بلکہ یہ تھی کہ آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ اگر ایک بار مجھے میدان جہاد میں لے جاتے تو پھر شاید مجھے کمزوری کا طعنہ نہ دیتے۔ میں آپ کے ساتھ تیروں کی بارش میں کھڑی ہو سکتی ہوں لیکن آپ کے انتظار میں ہر روز صبح و شام کوٹھے کی چھت پر بیٹھ کر سمندر کی طرف دیکھنا میرے لیے صبر آزما ہوگا۔“

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ”یہی صبر عورتوں کا جہاد ہے۔ جو کام مرد میدان میں نہیں کر سکتے، وہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر کر سکتی ہیں۔ عورتیں خالدؓ اور مثنیؓ نہیں بن سکتیں لیکن ان کی ماؤں کا رتبہ حاصل کر سکتی ہیں۔ آج ہمارے سپاہی اپنے گھروں سے کوسوں دور لڑ رہے ہیں اور ان کے عزائم وہ عورتیں بلند رکھتی ہیں جو صبر و استقلال سے گھروں میں ماؤں، بہنوں اور بیویوں کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان پر اعتماد کی بدولت ان کے دل میں یہ خیال بے چینی پیدا نہیں کرتا کہ گھر پر ان کے ننھے بھائیوں اور بچوں کا کیا حال ہو گا۔ سلمیٰ! تم ہی بتاؤ۔ کیا وہ سپاہی جسے یہ خیال ہو کہ اس کی بیوی رو رو کر اندھی ہو گئی ہو گی اور بچے گلیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے، ایک بہادر کی طرح مسکرا کر جان دے سکتا ہے؟ فرض کرو، اگر میں نہ آؤں تو عرب کی دوسری ماؤں کی طرح خالد کو جہاد پر رخصت نہ کرو گی؟“

سلمیٰ نے جواب دیا۔ ”آپ یقین رکھیے! اگر آپ خالد کے لیے ایک برابر بنا گوارا نہیں کرتے تو میں بھی بُری ماں بننا پسند نہ کروں گی۔“

شام کے وقت ابوالحسن کا جہاز روانہ ہوا۔ سلمیٰ ناہید کے ساتھ چھت پر کھڑی

سمندر کی طرف دیکھ رہی۔ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ناہید نے کہا۔ ”امی جان! آپ نے آبا جان سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے سامنے آنسو نہ بہائیں گی۔“

سلمیٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بیٹی! کاش یہ میرے بس کی بات ہوتی، تمہارے باپ کے مقابلے میں میرا دل بہت کمزور ہے۔“ سلمیٰ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ ناہید نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”امی! آپ کو ابھی تک بخیر ہے۔ آپ بستر پر لیٹ جائیں!“

سرا ندیپ کے دربار میں

مہاراجہ سرا ندیپ تخت پر رونق افروز تھا۔ تخت سے نیچے دائیں بائیں آبنوس کی کرسیوں پر چند سردار حسب مراتب بیٹھے تھے۔ راجہ کے دائیں ہاتھ سب سے پہلی کرسی راج کمار اودھے رام کی تھی۔ راج کمار ایک خوش شکل اور بارعب نوجوان تھا۔ کرسیوں کے پیچھے دو قطاروں میں چند عمدہ دار ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ چوہدرہ دربار میں داخل ہوا اور رسمی آداب بجالانے کے بعد بولا: "مہاراج! دلیپ سنگھ حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔"

راجہ پریشان سا ہو گیا اور بولا: "دلیپ سنگھ آگیا! ابوالحسن اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟"

چوہدرے نے جواب دیا: "مہاراج! ان میں سے اس کے ساتھ کوئی نہیں ایک عرب نوجوان ہے اور وہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔"

راجہ نے بے وقار ہو کر کہا: "بلاؤ انہیں جلدی کرو۔"

چوہدرے کے واپس جانے کے تھوڑی دیر بعد دلیپ سنگھ ایک بیس بائیس سالہ عرب نوجوان کے ہمراہ داخل ہوا۔ دلیپ سنگھ کے ہاتھوں میں چاندی کا ایک طشت تھا جس

میں ایک سونے کی ڈبیا اور ایک خنجر تھا۔ خنجر کے دستے میں بیش قیمت ہیروں کے نگینے جگمگا رہے تھے۔ دلیپ سنگھ دروازے اور تخت کے درمیان مختلف مقامات پر تین بار جھکا۔ پھر آگے بڑھا اور راجہ کے سامنے طشت رکھنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس دوران میں راجہ ولی عہد اور باقی حاضرین دربار کی نگاہیں زیادہ تر اس کے نوجوان ساتھی پر مرکوز رہیں۔

یہ زمانہ جس سے ہماری داستان تعلق رکھتی ہے، عرب کے صحرائیوں کی تاریخ کا سنہری زمانہ تھا۔ اسلامی فتوحات کی سیلابی موجوں موجوں کے سامنے اس سے کئی سال قبل کفر کے مضبوط ترین قلعوں کی دیواریں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور اب ایک زبردست ریلا انہیں خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ ترکستان، آرمینیا اور شمالی افریقہ کے میدانوں میں ان کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ فتوحات کے سیلاب کی ایک لہر مشرق میں کمران تک پہنچ چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قرب و جوار کے ممالک کے باشندے ہر عرب کے چہرے پر سکندر کا تخت اور سطوی سی فراست اور سلیمان کا سا جہ و جلال دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ روئے زمین کی ایک پسماندہ قوم اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر دنیا کی نگاہوں میں وہ بلندی حاصل کر چکی تھی جو آج تک کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی۔

سیلون (سرا ندیپ) کے راجہ کے دربار میں وہ نوجوان کھڑا تھا جس کے آباؤ اجداد یرموک اور قادیسیہ کی جنگوں میں مشرق اور مغرب کی دو عظیم ترین سلطنتوں کی عظمت خاک میں ملا چکے تھے، وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جن کی صورت دیکھنے کے بعد کسی کو ان کی سیرت کے متعلق تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ راجہ اور اس کے درباری ایک نظریں اس کی صورت اور سیرت کی ہزاروں خبریں کے معترف ہو چکے تھے۔ وہ بے پروائی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور دیکھنے

والوں کی نکاہیں اس کے جسم کی ہر جنبش میں ایک غایت درجہ کی خود اعتمادی دیکھنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور تمام حاضرین ہمہ تن گوش بن گئے۔ کچھ دیر "السلام علیکم" کے الفاظ راجہ اور درباریوں کے کانوں میں گونجتے رہے۔ راجکار "وعلیکم السلام" کہہ کر مسکراتا ہوا اٹھا اور تمام سردار اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ راجکار نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور تمام سردار دربار کے آداب کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے باری باری آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرنے لگے۔ راجکار نے اسے اپنے قریب بٹھالیا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کرنے لگا۔

راجکار نے پوچھا "آپ کا نام؟"

زیر نے جواب دیا "زیر"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بصرہ سے"

"ابوالحسن اور ان کے ساتھیوں کا پتہ چلا؟"

زیر نے جواب دیا "نہیں! مجھے ڈر ہے کہ وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار ہو چکے ہیں"

راجکار کے چہرے پر پشیمردگی چھا گئی۔

راجہ کچھ دیر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے راجکار کی باتوں پر خوش ہونا چاہیے یا ناراض، حاضرین تخت کی بجائے اُن دو کرسیوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن پر راجکار اور عرب نوجوان رونق افروز تھے اور راجہ کے لیے یہ نئی بات تھی لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کے منہ سے عربی کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سننے کی مسرت اس تلخی پر غالب آ رہی تھی۔ بالآخر اس نے کہا "ہم آپ کو دیکھ بہت خوش ہوئے ہیں"

زیر نے جواب دیا "شکر یہ! سراندیپ کے راجہ کو ہمارے خلیفہ اور والی

عراق سلام کہتے ہیں"

یہ فقرہ نصف عربی اور نصف سراندیپ کی زبان میں ادا کیا گیا۔ راجہ اور ولی عہد کی مسکراہٹ دیکھ کر تمام درباری ہنس پڑے۔

راجہ نے پوچھا "آپ نے ہماری زبان کہاں سے سیکھی؟"

زیر نے دلپ سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہ میرے استاد ہیں"

راجہ اور درباریوں نے دلپ سنگھ کو پہلی دفعہ توجہ کا مستحق سمجھا۔ راجہ نے کہا۔

"ہاں دلپ! ابوالحسن کا کچھ پتہ نہیں چلا؟"

دلپ سنگھ نے جواب دیا "مہاراج! اس سال ہمارے ملک کا کوئی جہاز عرب

کی کسی بندرگاہ تک نہیں پہنچا۔ بصرہ، مکہ، مدینہ اور دمشق میں ہر جگہ ان میں سے کسی

نہ کسی کے رشتہ دار موجود تھے لیکن سب نے یہی بتایا کہ وہ حج پر نہیں پہنچے۔ واپسی پر

میں ہر بندرگاہ سے ان کا سراغ لگاتا آیا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے

ساحل کے قریب ان کا جہاز کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ مہاراج نے دمشق کے

بادشاہ اور عراق کے حاکم کو جو تحائف بھیجے تھے، وہ بھی ان کے پاس نہیں پہنچے، پھر

بھی وہ آپ کا شکر یہ ادا کرتے تھے۔ میں اُن کی طرف سے یہ تحائف آپ کی خدمت

میں لایا ہوں۔ اس سونے کی ڈبیا میں ایک ہیرا ہے۔ یہ دمشق کے بادشاہ نے بھیجا

ہے اور یہ خنجر عراق کے حاکم نے۔ میں عربی نسل کے آٹھ گھوڑے بھی لایا ہوں چار

سفید ہیں جو بادشاہ نے دیے ہیں اور چار مشکلی ہیں جو عراق کے حاکم نے بھیجے ہیں۔

انہیں شاہی اصطبل میں پہنچا دیا گیا ہے۔"

راجہ نے جھک کر ڈبیا اٹھائی اور کھول کر کچھ دیر چمک دار ہیرا دیکھنے کے بعد

خنجر اٹھا کر اس کے دستے کی تعریف کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے دونوں تحفے راجکار

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دیکھو راجکار! یہ تحفہ اس بادشاہ کا ہے جس کا لوہا ہر

بچوں کو بصرہ پہنچا دینے کا بندوبست کریں، وہ آپ کے ایلچی کے ساتھ اپنی فوج کے ایک سالار زبیر کو ایک جہاز دے کر بھیج رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ بہت جلد ان کی روانگی کا بندوبست کر دیں گے۔ دانی بصرہ کا خیال ہے کہ ابوالحسن اور اس کے ساتھی ہندوستان کے مغربی ساحل پر کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر یہ پتہ چلا کہ ان کا جہاز کسی علاقہ کے بحری لیٹروں نے غرق کیا ہے تو انھیں سزا دینے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہوگی۔

خط کا مضمون سننے کے بعد راجہ گردن جھکائے دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ زبیر نے راجا کی طرف دیکھا۔ وہ آبدیدہ ہو کر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زبیر نے کہا: "آپ بہت پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عربوں کے ساتھ بہت انس تھا۔"

راجا کے بچنے ہوئے ہونٹوں پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس نے آنسوؤں کو ضبط کر نیکی ناکام کوشش کی پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور کوئی بات کہنے بغیر عقب کے کمرے میں چلا گیا۔ راجہ کو بذات خود ابوالحسن کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ اس کی موت کی خبر اس کے لیے کم المناک نہ تھی لیکن مسلمانوں کے خلیفہ کے ایلچی کی موجودگی کا احساس اسے انتہائی ضبط سے کام لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ راجا کے اٹھ جانے کے بعد اس نے زبیر اور دلیپ سنگھ کے سوا تمام درباریوں کو رخصت کا حکم دیا اور زبیر سے کہا: "راجا کو ابوالحسن کے ساتھ بے حد انس تھا۔ میں بھی اسے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے لیکن یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی مرچکے ہیں ممکن ہے کہ انھیں راستے میں بحری ڈاکوؤں نے گرفتار کر لیا ہو۔ مجھے سب سے زیادہ بے چاری ناہید کا دکھ ہے۔ ابھی وہ اپنی ماں کا غم نہیں بھولی۔ اب یہ صدمہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔"

زبیر نے سوال کیا: "ناہید کون ہے؟"

راجہ نے جواب دیا: "وہ ابوالحسن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ میں بھی اسے اپنی ہی بیٹی سمجھتا ہوں۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس کے بعد راجہ دلیپ سنگھ کی طرف متوجہ ہوا: "دلیپ!"

لوہے کو کاٹتا ہے۔ جس کی سلطنت میں کئی دریا، کئی پہاڑ اور کئی سمندر ہیں، جس کے سپاہی پتھر کے قلعوں کو مٹی کے گھروں سے سمجھتے ہیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دریاؤں کو عبور کرتے ہیں اور یہ خنجر مجھے عراق کے حاکم نے بھیجا ہے جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کا پتہ ہیں۔"

راجا کو کسی اور خیال میں تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں بے پروائی سے دیکھیں اور وزیر کے ہاتھوں میں تھادیں۔ یہ تحائف تجھیں سرانندپ کا سادہ دل راجہ روئے زمین کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔ یکے بعد دیگرے تمام درباریوں کے ہاتھوں میں گردش کرنے کے بعد پھر راجہ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ کبھی خنجر کا دستہ ٹوٹا اور کبھی ڈیا کھول کر دیکھتا۔ بالآخر اس نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا: "میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے تمہارے بادشاہ کو دیکھوں۔"

زبیر نے کہا: "ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔"

راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "ابوالحسن بھی یہی کہا کرتا تھا کہ مسلمان کسی کو بادشاہ نہیں بناتے۔ آہ بابے چارہ کتنا اچھا آدمی تھا۔ تلوار کا دھنی، بات کا پکا۔ اس کی لڑکی کو کس قدر صدمہ ہوگا اور وہ عبدالرحمن اور یوسف کس قدر شریف تھے۔ بھگوان جانے یہ خبر سن کر ان کے بال بچوں کی کیا حالت ہوگی، آپ ان سے ملے ہیں؟"

"جی نہیں! میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔" زبیر نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر راجہ کو پیش کرتے ہوئے کہا: "یہ خط مجھے بصرہ کے حاکم نے دیا ہے۔"

راجہ نے دلیپ سنگھ کو اشارہ کیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر سے خط لے لیا اور اسے کھول کر ترجمہ سناتے لگا۔

"ہمارا راجہ کو دانی بصرہ سلام کہتے ہیں۔ وہ عرب تاجروں کی بیواؤں اور یتیم بچوں کے ساتھ نیک سلوک کے ممنون ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہمارا راجہ ان بیواؤں اور یتیم

انھیں مہمان خانے میں لے چلو! اس بات کا خیال رکھنا کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو،
میں زرا جگمادی کو ان بچوں کو تسلی دینے کے لیے بھیجتا ہوں۔“

زیر نے کہا: ”میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا تھا۔ ان بچوں کو ابھی تک نہیں دیکھا۔“
”بہت اچھا۔ دلپ سنگھ! انھیں ان کے پاس لے جاؤ!“

(۲)

محل کے دروازے پر دلپ سنگھ اور زیر کو انیس برس کا ایک نوجوان ملا۔ اس نے
دلپ سنگھ کو دیکھتے ہی سوال کیا: ”کیا یہ سچ ہے کہ آبا جان کا جہاز جدہ نہیں پہنچا؟“
دلپ سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے گلے لگا لیا اور کہا: ”خالد! میں ہر شہر اور ہر بندرگاہ
میں انھیں تلاش کر چکا ہوں لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔“

خالد نے کہا: ”میں ابھی بندرگاہ سے ہو کر آیا ہوں۔ عرب کے چند جہاز ران بتاتے
تھے کہ ان کا جہاز سندھ کے ساحل کے قریب غرق ہو چکا ہے۔ آپ دیبل کے حاکم
سے ملتے، شاید کوئی سراغ مل جاتا۔“

دلپ سنگھ نے جواب دیا: ”سندھ کا راجہ اور اس کے اہلکار بہت مغرور ہیں، مجھے
ڈر تھا کہ دیبل کا سردار مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے گا۔ اس لیے میں نے خود وہاں جانے
کی بجائے مکران کے مسلمان گورنر سے کہا تھا کہ وہ اپنا ایلچی بھیج کر معلوم کریں۔ دمشق میں
آپ کے خلیفہ اور بصرہ میں حجاج بن یوسف سے ملنے کے بعد میں واپسی پر پھر مکران کے
حاکم سے ملا تھا۔ سندھ سے ان کا ایلچی واپس آچکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دیبل کے حاکم
نے اس جہاز کے متعلق لا علمی ظاہر کی ہے۔“

خالد نے کہا: ”میں بندرگاہ سے سیدھا اسی طرف آیا ہوں۔ کیا آپ ہمارے
گھروں میں یہ خبر پہنچا چکے ہیں؟“

”نہیں! ہم ابھی وہاں نہیں گئے۔ میں انھیں مہمان خانے میں ٹھہرا کر تمھارے ساتھ
چلتا ہوں۔“

خالد زیر کی طرف متوجہ ہوا: ”آپ کی مہمان خواندگی ہمارا حق ہے۔ آپ میرے ساتھ
چلیں۔ کم از کم عورتوں اور بچوں کو تسلی دینے کے لیے تو —“
زیر نے کہا: ”چلو دلپ سنگھ!“

اس نے جواب دیا: ”اگر مناسب خیال کریں تو آپ خالد کے ساتھ ہو آئیں میں اتنی
دیر میں آپ کے ساتھیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر آؤں۔“

زیر خالد کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے پوچھا: ”تم ابو الحسن کے بیٹے ہو؟“
”ہاں! لیکن آپ کو کس نے بتایا؟“

”میں تمام راستے دلپ سنگھ سے تم لوگوں کے متعلق پوچھتا آیا ہوں۔ اس کی
باتوں سے تمھاری جو تصویر میرے ذہن میں تھی، تم اس سے مختلف نہیں ہو جس صبر و
سکون کے ساتھ تم نے یہ المناک خبر سنی ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم
سچے خالد ہو؟“

خالد نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ”جب آبا جان حج
کے لیے رخصت ہوئے تھے تو میں نے بھی ساتھ جانے کیلئے اصرار کیا تھا۔ امی کی علالت
کی وجہ سے انھوں نے مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ میں اس وقت پہلی بار رویا
تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر انھیں بہت دکھ ہوا تھا۔ انھوں نے کہا: ”بیٹا!
خالد رویا نہیں کرتے۔ میں نے تمھیں اس مجاہد اعظم کا نام دیا ہے جو زخموں سے چور
ہونے کے باوجود اُف تک نہ کرتا تھا۔“

(۳)

شہر کے ایک کونے پر ایک ندی کے پاس عرب تاجروں کے مکانات تھے ندی

کے دونوں کناروں پر ناریل کے سرسبز درخت کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خالد نے چھر کی ایک چار دیواری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ ہے ہمارا مکان“۔ چار دیواری کے اندر کیلوں اور ناریل کے درختوں کا ایک گنجان باغیچہ تھا۔ چھر کے چھوٹے سے مکان کے سامنے ایک چبوترے پر بانس کا چھڑ تھا، جسے ایک سرسبز بل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا بند ہونے سے فضا میں حرارت بڑھ رہی تھی۔ زیر کو پسینے میں شرابور دیکھ کر خالد نے اُسے مکان کے اندر لے جانے کی بجائے اس چبوترے پر بٹھانا مناسب خیال کیا۔

زیر بید کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ خالد کے اشارے سے ایک سیاہ فام لڑکا پیچھے سے اسے ہوا دینے لگا۔ سیاہ فام لڑکا پیچھا ہلانے میں ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا تھا لیکن زیر نے خالد سے کہا: ”ہمیں اس گرمی میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہیے! اسے کو آرام کرے۔“ سیاہ فام لڑکے نے عربی میں جواب دیا: ”آپ ہمارے مہمان ہیں۔ مجھے خدمت کے حق سے محروم نہ کیجیے!“

زیر نے کہا: ”اوہو! تم عربی جانتے ہو؟“ لڑکے کی بجائے خالد نے جواب دیا: ”یہ بچپن سے ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اسے ہمارے آبا جہان نے پالا تھا۔“ لڑکے نے مزید تعارف کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا: ”اور میں مسلمان ہوں میرا نام علی ہے۔“ خالد نے سرانداپ کی زبان میں کچھ کہا اور علی پکھا دکھ کر بھاگتا ہوا واپس ہی ایک ناریل کے اونچے درخت پر رکھ کر چند ناریل توڑ لایا۔ ناریل کا پانی پینے کے بعد زیر خالد سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اپنے باپ کے المناک

انجام کی خبر کے باوجود خالد عربوں کی روایتی نہان نوازی کا ثبوت دینے کے لیے زیر کی ہر بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم زیر نے کئی بار محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک غمگین مسکراہٹ آہوں اور آنسوؤں سے کہیں زیادہ جگمگ رہ رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے خالد نے کئی بار باہر کے پھاٹک کی طرف اٹھ اٹھ کر دیکھنے کے بعد علی سے پوچھا: ”علی! ناہید ابھی نہیں آئی۔ جاؤ اسے بلاؤ!“ علی اٹھ کر باہر نکل گیا۔ خالد نے زیر سے کہا: ”منارانی اور راجہ کی بیٹی کو میری بہن سے بہت محبت ہے۔ آج صبح وہ خود یہاں آکر اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اسے یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوگا۔ وہ ابھی تک امی کی قبر پر ہر روز جایا کرتی ہے اور اب!“ یہاں تک کہ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

زیر نے منموم لہجے میں پوچھا: ”آپ کی والدہ کب فوت ہوئیں؟“ انھیں فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ آبا کے حج پر جانے کے بعد وہ چھ مہینے موسمی بخار میں مبتلا رہیں لیکن ان کی موت کا باعث آبا جہان کا لاپتہ ہونا تھا۔ وہ صبح اور شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔ جب دُور سے کوئی جہاز نظر آتا تو ان کے چہرے پر رونق آ جاتی۔ وہ مجھے خبر لانے کے لیے بندرگاہ کی طرف بھیجتیں اور جب میں مایوس لوٹتا تو دُور سے میری شکل دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پھر اجاتیں۔ زندگی کی آخری شام ان میں زینے پر پاؤں رکھنے کی ہمت نہ تھی۔ ان کے اصرار پر ہم ان کی چارپائی چھت پر لے گئے۔ وہ تنکے کا سہارا لے کر دیر تک سمندر کی طرف ٹٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔ بد قسمتی سے ہمیں اس دن کوئی جہاز بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نماز مغرب کی اذان سن کر نیچے اترا اور یہاں سے نزدیک ہی ایک مسجد میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ آخری سالس لے چکی تھیں۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُور افق پر کسی جہاز کو دیکھ رہی ہیں۔ ناہید نے مجھے بتایا کہ ان کے آخری الفاظ یہ تھے:

لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا جو متاثر ہونے والی نگاہوں کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ شام اور فلسطین میں بے شمار بے باک نگاہیں اس کے مردانہ حسن کا اعتراف کر چکی تھیں، لیکن اس دور کے عام نوجوانوں کی طرح وہ نگاہیں نیچی رکھنے کا عادی تھا۔

زبیر جہاز پر سفر کے دوران دلیپ سنگھ سے ہر عرب بچے کے متعلق سوالات پوچھ کر اپنے ذہن میں ان کی خیالی تصویریں بنا چکا تھا۔ دلیپ سنگھ سے ابوالحسن اور اس کے بچوں کے متعلق جو کچھ وہ سُن چکا تھا، اس سے اس کا اندازہ یہ تھا کہ ابوالحسن کے بچے شکل و شباهت اور عادات و اطوار میں باقی تمام بچوں سے مختلف ہوں گے۔ یہ اُس کی دلچسپی کی پہلی وجہ تھی۔ پھر خالد کی زبانی جو کچھ اُس نے سنا، اس کی دلچسپی میں اضافہ بھی ہو گیا اور اس کے بعد جب علی ناہید کو بلانے کے لیے گیا تو سابقہ دلچسپی کے ساتھ ایک ہلکی سی خلش کا بھی اضافہ ہو گیا لیکن اس کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی قوم کی ایک ستم رسیدہ لڑکی تھی۔

ناہید نے پھر کہا: ”مجھے جواب دیجئے، کیا یہ سچ ہے؟ آپ مجھ سے کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ میں سُن چکی ہوں۔“

خالد نے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا: ”ناہید! تقدیر کے سامنے کسی کا کالس نہیں چلتا۔“

زبیر نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس کوئی خوشی کی خبر نہیں لاسکا۔“

ناہید کوئی اور بات کیے بغیر مکان کی طرف چل دی اور چند قدم آہستہ آہستہ اٹھانے کے بعد بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

خالد ایک لمحہ کے لیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر زبیر کی طرف دیکھ کر بولا: ”میں ابھی آتا ہوں۔“

”ناہید! تمہارے آبا آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ وہ بے وفا نہیں، میں بے وفا ہوں، جو ان کا انتظار نہ کر سکی۔“

زبیر نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں تیروں اور نیروں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ وہ ایک نڈر ملاح تھا اور فقط طوفانوں سے کھیلنا جانتا تھا۔ اس کی زبان یلٹھے اور شیریں الفاظ سے نا آشنا تھی۔ خالد کی باتوں سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود وہ تسلی اور تشفی کے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا: ”خالد! مجھے ان کے حسرت ناک انجام کا بہت دکھ ہے۔ کاش! میں تمہارے حصے کا بوجھ اٹھا سکتا۔“

علی بھاگتا ہوا واپس آیا اور کہنے لگا: ”وہ آ رہی ہیں۔“

زبیر کی نگاہیں نادانستہ باہر کے دروازے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ ناہید آئی اور دوڑے اپنے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر جھجکی، رُکی اور چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔

زبیر کو ایک دلگداز آواز سنائی دی۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ آبا جان.....“

فقرے کا آخری حصہ ہچکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

زبیر لسوانی حسن و وقار کی ایک غیر فانی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کے لیے تیار نہ تھیں اور پیشتر اس کے کہ ناہید کا چہرہ نقاب میں چھپتا، اس کی نگاہوں کا رخ بدل چکا تھا۔ وہ سامنے دیکھنے کی بجائے نیچے دیکھ رہا تھا۔

زبیر میں غایت درجہ کی جیا والدین اور ماحول کی تربیت کا نتیجہ تھی اور اس کے علاوہ اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی حسد درجہ خود اعتمادی تھی۔ وہ لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ دور دراز کے ممالک میں چکر لگا چکا تھا۔ اوائل شباب میں اسے ایک تجربہ کار جہاز دان مانا جاتا تھا۔ وہ دور دراز کے ممالک میں غیر اقوام کی آن سرخ و طرار

خالد بھاگ کر ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ ناہید بستر پر منہ کے بل پڑی چکیاں بھر رہی تھی۔ خالد نے پیار سے اس کا بازو پکڑ کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "ناہید! صبر سے کام لو۔"

علی زبیر کے پاس تھوڑی دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ ناہید کی آہیں سن کر اُسے زمین کی ہر نئے اداس اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ وہ سہمتا اور جھکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ڈرتے ڈرتے خالد کے بازو کو چھو کر بولا: "آپا ناہید کیوں رو رہی ہیں؟" خالد نے اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "علی! انا جان واپس نہیں آئیں گے۔" کم سن بچے کے منہ سے ایک جگر دوز پھج نکلی: "نہیں! یہ نہیں! یہ نہ کیے! وہ ضرور آئیں گے۔"

خالد نے کہا: "یہ دلیپ سنگھ کے ساتھ آئے ہیں۔ اُن کا جہاز شاید غرق ہو چکا ہے۔"

علی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے چھوٹ نکلے اور وہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر چیخوں کو ضبط کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اس کی آواز سننے والا کوئی نہ ہو لیکن باہر نکلتے ہی اس نے پڑوس کے بہت سے لوگ اپنے گرد جمع کر لیے۔ تھوڑی دیر میں عربوں کے تمام بچے عورتیں اور مرد خالد کے مکان کے صحن میں جمع ہو گئے۔ لوگوں کا شور و غوغا سن کر خالد باہر نکلا اور بیک وقت کئی زبانیں اس سے مختلف سوالات پوچھنے لگیں۔

طلحہ نے آگے بڑھ کر سب کو خاموش کیا اور خالد سے پوچھا: "کیا جہاز کے غرق ہونے کی خبر درست ہے؟"

خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا: "کیا یہ خبر آپ لائے ہیں؟" زبیر نے جواب دیا: "مجھے افسوس ہے کہ میں کسی اچھی خبر کا ایچی نہ بن سکا۔" طلحہ نے پوچھا: "جہاز کیسے غرق ہوا؟" خالد نے جواب دیا: "ہم یہ معلوم نہ کر سکے۔" زبیر نے بیواؤں اور یتیموں کو فردا فردا تسلی دینے کے بعد غربت واپس جانے کے متعلق ان کے ارادے دریافت کیے۔

یتیم بچوں اور بیواؤں نے یک زبان ہو کر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ زبیر دیر تک ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ بالآخر نماز عصر کی اذان سن کر اس نے لوگوں کے ہمراہ مسجد کا رخ کیا۔

طلحہ کے اصرار پر زبیر نے امام کے فرائض انجام دیے۔ جب وہ مسجد سے نکلنا تو دروازے پر راجکار اور دلیپ سنگھ کھڑے تھے۔ خالد کو دیکھ کر راجکار کی سیاہ اور چمک دار آنکھیں پر نم ہو گئیں اور اس نے آگے بڑھ کر خالد کو گلے لگالیا۔

دلیپ سنگھ نے زبیر سے کہا: "مہاراج نے آپ کو یاد کیا ہے۔ خالد تم بھی چلو!" زبیر نے کہا: "میں ابھی اُن سے مل کر آیا ہوں۔ کوئی خاص بات تو نہیں؟" "مہاراج کے دل پر ابوالحسن کی موت کی خبر نے گہرا اثر کیا تھا۔ اس وقت وہ آپ سے زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے۔"

زبیر نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ راجکار کو بھی ان کے ساتھ گہری محبت تھی۔ ان کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے۔"

دلیپ سنگھ نے کہا: "ہاں! راجکار کو بہت صدمہ ہوا ہے۔ وہ انھیں بہت پیار کرتے تھے۔"

تھارے باپ کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا جہاز طوفان کے باعث غرق ہو چکا ہے لیکن اگر یہ ثابت ہو گیا کہ راستے میں کسی نے جملہ کر کے اُن کا جہاز غرق کر دیا ہے تو میں اس کی ہر کوئی کے لیے اپنے تمام ہاتھی اور سارے جہاز بصرہ کے حاکم کے سپرد کر دوں گا۔

راجہ نے اسے کہنے کی طرف اشارہ کر کے بیٹھ گیا۔ راجہ اور خالد بھی بیٹھ گئے لیکن دلپ سنگھ کھڑا رہا۔ اس نے کہا: "میرا دل ہے کہ میں اپنے تمام ہاتھی اور سارے جہاز راجہ کے سپرد کر دوں گا۔" راجہ نے کہا: "بیٹھ جاؤ، تم نے بہت بڑا کام کیا ہے کل تم نے تم ہمارے دربار میں تمام سرداروں سے آگے راجہ کے پاس بیٹھا کر دلیپ سنگھ آگے بڑھ کر راجہ کے پاؤں چھونے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا اور راجہ نے اسے مخاطب ہوا: "میں بصرہ کے حاکم کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر آپ عرب بچوں کو لاوارث سمجھ کر یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ میں انھیں اپنے بچے سمجھتا ہوں۔ اگر وہ یہاں رہیں تو ان کی ہر ضرورت ہمارے شاہی خزانے سے پوری ہوگی، آپ ان سے پوچھ لیں، اگر انھیں یہاں کوئی تکلیف ہو تو بے شک انھیں اپنے ساتھ لے جائیے۔"

راجہ نے جواب دیا: "انھیں یہاں کوئی شکایت نہیں اور میں اپنی حکومت اور تمام عربوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری قوم کے یتیم بچے اپنے ملک سے اس قدر دور رہیں۔ ان کی بہترین تعلیم و تربیت وہیں پر ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ پسند کریں گے تو انھیں یہاں بھیج دیا جائے گا۔"

راجہ نے پوچھا: "آپ سب کو لے جانا چاہتے ہیں؟" راجہ نے کہا: "نہیں بلکہ اور چند تاجر بھی لے جائیں گے۔"

(۴)

شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے زبیر کو لوگوں کا ایک ہجوم جلوں کی شکل میں دکھائی دیا۔ دلپ سنگھ نے کہا: "ہمارا آج آپ کے تحائف اور گھوڑوں کو دیکھ کر بھولے نہیں سماتے۔ ان کے حکم سے گھوڑوں کا جلوس نکالا گیا۔ گھوڑوں کی لگام تھام کر بازار میں چلنے کی عزت ان لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو ہماری ریاست کے سب سے بڑے سردار ہیں۔ اگر انھیں ابوالحسن کی موت کا غم نہ ہوتا تو شاید خود بھی اس جلوں میں شرکت کرتے۔"

زبیر نے قریب سے دیکھا تو دربار میں سب سے اگلی کرسیوں پر راجہ جہان ہونے والے آٹھ سردار گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہجوم کے آگے چلے آ رہے تھے۔ گھوڑوں پر خود و شاہی ڈالے گئے تھے وہ بیش قیمت موتیوں سے مرصع تھے۔

راجہ نے مسکراتے ہوئے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا: "کیا آپ کے ملک میں بھی گھوڑوں کی یہ عزت ہوتی ہے؟"

زبیر نے جواب دیا: "نہیں! ہم زیادہ تر ان کے چارے اور پانی کی فکر کیا کرتے ہیں۔"

دلپ سنگھ بولا: "یہ گھوڑوں کی عزت نہیں گھوڑے بھیجنے والوں کی عزت کی جا رہی ہے۔"

آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا نسبتاً خوشگوار ہو رہی تھی۔ راجہ محل کی دوسری منزل پر ایک درخت کے سامنے بیٹھا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

زبیر اور اس کے ساتھیوں کے قدموں کی چاپ سُن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آٹھ گز زبیر کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد خالد کی طرف متوجہ ہوا۔ "بیٹا! مجھے"

راجہ کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد بولا: "بیٹا! تم ابو الحسن کے بیٹے ہو۔ اگر تم ارادہ کر چکے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی مائیں تمہارے جیسے بچے جنتی ہیں۔"

خالد نے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں۔"

راجہ نے جواب دیا: "ابو الحسن کے بیٹے کی خوشی میری ناراضگی کا باعث نہیں ہو سکتی۔"

لیکن خالد اور اس کی بہن بھی تو یہیں رہیں گے نا؟

"نہیں! یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے!"

راجہ نے منموں لہجے میں کہا: "نہیں! انہیں ہم نہیں جانے دیں گے۔"

خالد کو میں اپنا بھائی بنا چکا ہوں۔

"اور ناہید میری بہن ہے۔" پچھلے کمرے کے پردے کی آڑ سے ایک نسوانی آواز آئی اور چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی راجہ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کا رنگ راجہ کی طرح سا نولا تھا لیکن چہرے کے نقوش اس کی نسبت تیکھے آنکھیں بنو بصورت اور چمک دار تھیں۔ اس نے خالد کی طرف دیکھا اور کہا: "بھیا! تمہیں بتانا چاہتی ہیں۔"

خالد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور لڑکی نے چلتے چلتے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا: "پتا جی! آپ ان کی باتیں نہ سنیں۔"

راجہ نے زہیر کی طرف دیکھ کر کہا: "دیکھا آپ نے؟"

زہیر نے کہا: "بہت اچھا، میں ان کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔"

خالد تھوڑی دیر بعد سر جھکائے واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ راجہ نے پوچھا: "بیٹا! انہوں نے یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم بتاؤ! تم یہاں رہنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

خالد نے جواب دیا: "آپ کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ اگر میرے پیش نظر دنیا کا کوئی آرام ہوتا تو میں آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑتا لیکن اس وقت ہماری قوم دور دراز کے ممالک میں جہاد کر رہی ہے اور میری رگوں میں ایک مجاہد کا خون ہے۔ میں نے سنا ہے کہ موجودہ وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھ سے کم عمر کے لڑکے بھی جہاد پر جا رہے ہیں۔ میں اس سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔"

لگے۔ شہر کے لوگوں نے اپنے مہانوں کو آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ الوداع کہی۔ عورتوں کے لیے جہاز کے اندر ایک کشادہ کمرے کے علاوہ بالائی تختہ کے ایک حصے پر بھی چلیں ڈال کر پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ خالد ادھر ادھر گھوم پھر ملاحوں کے کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ناہید، علی کے ساتھ تختہ جہاز پر کھڑی ناریل کے ان بلند قامت اور سرسبز درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ جن کی چھاؤں میں اس نے زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔

صبح شام میں تبدیلی ہو گئی اور سرانڈیپ کا ساحل افق پر ایک ہلکی سی سرسبز لکیر نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ لکیر بھی شام کے دھندلکے میں چھپ گئی۔ وہ آنسو جو دیر سے ناہید کی آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے، ٹپک پڑے، علی بھی اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر قدمے مول تھا۔ لیکن اس کے دل میں خالد اور ناہید کے ساتھ جانے کی خوشی اس سے کہیں زیادہ تھی۔

رات کے وقت مطلع صاف تھا۔ بچے اور عورتیں عرشے پر کھلی ہوئی سو گئے۔ ناہید دیر تک آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ چلن کی دوسری طرف خالد، زیر اور ملاحوں سے باتیں کر رہا تھا۔

ہاشم ایک آٹھ سال کا لڑکا ناہید کے قریب لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ البرالحسن کے ساتھ لاپتہ ہو چکا تھا۔ ہاشم آٹھ کر بیٹھے ہوئے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ناہید نے پوچھا۔ ”کیا ہے ہاشم؟“

اس نے سوال کیا۔ ”علی کہاں ہے؟“

”وہ خالد کے ساتھ ملاحوں سے باتیں کر رہا ہے۔“

”میں اس سے ایک بات پوچھ کر ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ہاشم تاریکی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا علی کے پاس پہنچا اور پوچھنے لگا۔ ”علی! جب جہاز ڈوب جاتا ہے تو کیا

راہبہ اور دلی عہد زبیر اور اس کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے لیے بندرگاہ پر دو جہاز سفر کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ایک جہاز پر زبیر، تیم بچوں اور بیواؤں کو لیے جا رہا تھا اور دوسرے جہاز پر ولیپ سنگھ راجہ کی طرف سے حجاج بن یوسف اور خلیفہ ولید کے لیے ہاتھی، سونا، چاندی اور ہیروں کے تحائف لے کر جا رہا تھا۔ ہاتھی تعداد میں دس تھے۔

راجہ اور دلی عہد زبیر اور اس کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے لیے بندرگاہ تک آئے۔ راجہ بیواؤں اور تیم بچوں میں سے ہر ایک کو گرانقدر تحائف دے چکا تھا۔ زبیر کو اس نے کئی چیزیں پیش کیں لیکن اس نے فقط گینڈے کی ڈھال پسند کی۔ رانی اپنا موتیوں کا بیش قیمت ہار سخت اصرار کے بعد ناہید کو پہنا سکی۔ راجہ کی رخصت کے دن اس کے گھر آئی اور بضد ہو کر ناہید کو اپنی ہیرے کی انگوٹھی دے گئی۔

بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہونے سے پہلے راجہ کی رانی نے آبدیدہ ہو کر خالد کو گلے لگا لیا اور اپنی موتیوں کی مالا اتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔

جہازوں کے بادبان کھولے گئے اور ہوا کے جھونکے جب زوں کو دھکیلنے

تیسرے دن مستول پر سے دونوں جہازوں کے پیرے داروں نے یکے بعد دیگرے افق شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو جہازوں کی آمد کا پتہ دیا اور جہاز دان پریشان ہو کر تختہ جہاز پر کھڑے ہو گئے۔ دلیپ سنگھ کا جہاز آگے تھا۔ وہ اپنے جہاز کو روکنے کا حکم دے کر زیر کا جہاز قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب دونوں جہاز ایک دوسرے کے بہت قریب پہنچیں تو دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”مکن ہے وہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے نہ ہوں، لیکن ہمیں مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ اپنا جہاز مغرب کی طرف لے جائیں، میں ان سے منٹ بولوں گا۔“

زیر نے جواب دیا۔ ”نہیں ہم خطرے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔“
دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”مجھے آپ کی ہمت پر شبہ نہیں لیکن ہماری سب سے پہلی ذمہ داری بچوں کی جان بچانا ہے۔“

زیر نے جواب دیا۔ ”اگر وہ واقعی بحری ڈاکو ہیں، تو ممکن ہے کہ مغرب کی طرف سے بھی انھوں نے ہمارا راستہ روک رکھا ہو۔ اس صورت میں بھاگ نکلنے کی بجائے، لوٹنا کم خطرناک ہوگا اور ہم سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اپنے دوستوں کی جانیں خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔“

”آپ کی مرضی۔ تاہم عورتوں کو حکم دیں کہ وہ نیچے چلی جائیں۔“
دلیپ سنگھ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔
زیر نے خالد سے کہا ”خالد! تم عورتوں اور بچوں کو نیچے لے جاؤ۔“
دونوں جہازوں کے ملاح کیل کانٹے سے لیس ہو کر دور سے آنے والے جہازوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد دلیپ سنگھ ایک جہاز کا سیاہ جھنڈا پہچان کر چلایا۔ ”یہ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ہیں۔ مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

زیر نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بھائیو! یہ عورتیں اور بچے ہمارے

ہوتا ہے۔“
علی نے بھولے پن سے جواب دیا۔ ”سمندر کی تہ میں چلا جاتا ہے۔“
ملاح اس جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
باشم نے پھر کہا۔ ”واہ! یہ تو مجھے معلوم تھا۔ میں پوچھتا ہوں، لوگ کہاں جاتے ہیں؟“
”لوگوں کو مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔“

”جھوٹ! مچھلیوں کو تو آدمی کھاتے ہیں۔“
علی نے پھر جواب دیا۔ ”زمین پر آدمی مچھلیوں کو کھاتے ہیں لیکن سمندر میں مچھلیاں آدمیوں کو کھا جاتی ہیں۔“
باشم کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا اور واپس آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

(۲)

چند دنوں کے بعد یہ جہاز مالا بار کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں سامانِ خوراک اور تازہ پانی حاصل کرنے کے لیے انھیں مغربی ساحل کی مختلف بندرگاہوں پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ اس دوران میں انھیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ مالا بار کی ایک بندرگاہ پر چند عرب تاجروں نے زیر کا خیر مقدم کیا اور گزشتہ طویل سفر میں تھکے ہوئے مسافروں کو چار دن کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ ان چار دنوں میں سرانندپ کے راجہ کے گر انقدر تحائف کی خبر دور دور تک مشہور ہو چکی تھی۔

رخصت کے دن حاکم شہر بندرگاہ پر زیر اور دلیپ سنگھ سے ملا اور اس نے انھیں راستے میں بحری ڈاکوؤں کے حملے کے خطرے کے پیش نظر ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔
دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں! ہمارے جہاز پوری طرح مسلح ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر ایک سپاہی کے قریب بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تیروں کی لڑائی ہوتی رہی۔ لیٹرے زیادہ قریب پہنچ کر جلتے ہوئے تیر پھٹنے لگے۔ دوسری طرف سے زبیر کی ہدایت کے مطابق ابراہیم اور عمر نے اپنی کشتیاں سیڑھی لیٹروں کے جہازوں کی طرف چھوڑ دیں اور قریب پہنچ کر جلتی ہوئی مشعلوں سے گھاس کو آگ لگائی اور خود پانی میں کود گئے۔ لیٹرے جو ہاتھوں میں کندیں لیے ہوئے اپنے حریف کے جہازوں پر کودنے کے لیے تیار کھڑے تھے بدحواس ہو کر کشتیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہوائی کے جھونکوں نے کشتیوں سے آگ کے مشعلوں کو جہازوں کے بادبانوں تک پہنچا دیا۔ ان کی آن میں لیٹروں کے دونوں جہازوں پر آگ بے قابو ہو چکی تھی اور وہ جیتے چلاتے سمندر میں پھیل گئیں لگا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دلیپ سنگھ اور زبیر کے آدمی تیر برسا رہے تھے۔ زبیر نے لیٹروں کا ایک جہاز اپنے جہاز کے بالکل قریب آنا دیکھ کر آگ کے خطرہ سے بچنے کے لیے لنگر اٹھانے کا حکم دیا لیکن اتنی میں آٹھ دس لیٹرے کندیں ڈال کر زبیر کے جہاز پر کودنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ زبیر کے ساتھیوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ لیٹروں کے جہاز سے ایک تیر آیا، اور زبیر کے بائیں بازو میں پوسٹ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ناہید کی کمان سے ایک تیر نکلا اور ایک لیٹرے کے سیلے میں پیوست ہو گیا۔

زبیر نے مرعبا کہا۔ ناہید نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ زبیر کمان پھینک کر بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے کمان نیچے رکھ کر ایک ہاتھ سے زبیر کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکال دیا۔ تیر کے نکلنے ہی زبیر کے بازو سے خون کی دھار بہہ نکل۔ ناہید نے اس کی تھیں کی آستین اوپر چڑھائی اور جھٹ سے اپنے چہرے کا نقاب اتار کر زخم پر باندھ دیا۔

زبیر کا جہاز کندوں کی زد سے نکل چکا تھا اور جلتے ہوئے جہاز کے رہے سہے

پاس امانت ہیں۔ ہمیں انہیں سلامتی سے بصرہ پہنچانا ہے۔ اگر ہم پر ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہ ہوئی، تو ہمارا طریق جنگ اس طریقے سے مختلف ہوتا جو میں نے اب تجویز کیا ہے۔ میں ایک خطرناک مہم کے لیے تم میں سے دو رضا کار چاہتا ہوں۔

اس پر سب سے پہلے خالد اور اس کے بعد تمام ملاحوں نے یکے بعد دیگرے اپنے نام پیش کیے۔ زبیر نے کہا۔ ”اس کام کے لیے دو بہترین تیراک درکار ہیں۔ میں یہ کام ابراہیم اور عمر کو سونپتا ہوں۔“

زبیر کی ہدایت پر دونوں جہازوں سے دو کشتیاں سمندر میں اتار دی گئیں اور ان کے ساتھ بادبان باندھے گئے۔ دلیپ سنگھ کے جہاز پر ہاتھیوں کے لیے خشک گھاس موجود تھی۔ ملاحوں نے اس کے چند گٹھے اتار کر کشتیوں پر لاد دیے۔ ابراہیم اور عمر ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لے کر کشتیوں پر سوار ہو گئے۔ اس کے بعد زبیر اور اس کے ساتھی ترکش اور کمانیں سنبھال کر حملہ آوروں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اگلے جہاز کا رخ دلیپ سنگھ کے جہاز سے زیادہ زبیر کے جہاز کی طرف تھا۔ عمر اور ابراہیم کی کشتیاں ایک لمبا چکر کاٹ کر حملہ آوروں کے عقب میں پہنچ چکی تھیں۔

زبیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ حملہ آور جہاز نے قریب آتے ہی زبیر کے جہاز پر تیر برسانے شروع کر دیئے اور ایک تیر سن نئے زبیر کے سر کے قریب سے گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ آپ کسی محفوظ جگہ بیٹھ جائیے! ہم دشمن کے تیروں کی زد میں آچکے ہیں۔“

زبیر نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ناہید تیر و کمان ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ آنکھوں کے سوا اس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ زبیر نے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ نیچے! ناہید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں تیر چلانا جانتی ہوں۔“

ملاج مایوس ہو کر پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ زبیر نے دوبارہ کمان اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”ناہید! اب تم غورتوں کے پاس جاؤ اور انھیں تسلی دو کہ ہم خدا کے فضل سے فتح حاصل
 کر چکے ہیں۔“

ناہید نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔ ”آپ کو تکلیف تو نہیں؟“
 ”نہیں یہ بہت معمولی زخم ہے۔ تم میری فکر نہ کرو!“ یہ کہتے ہوئے ایک لمحہ کے
 لیے زبیر کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ناہید کے چہرے پر گز گئیں۔ سپاہیانہ وقار اس کے
 خدو خال کی دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ ناہید نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بے نقاب ہے،
 اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی نیچے اتر کر غورتوں کے پاس چلی گئی۔
 جلتے ہوئے جہاز سے چند آدمی اتر کر ایک کشتی پر سوار ہوئے اور ایک آدمی جو ڈاکوؤں
 کا سردار معلوم ہوتا تھا، سفید جھنڈا لہرانے لگا۔ زبیر نے تیر اندازوں کو ہاتھ کے اشارے سے
 منع کیا۔ عمر اور ابراہیم اپنا کام کر کے جہاز کے قریب پہنچ چکے تھے۔ زبیر نے اپنے جہاز کو خطر
 سے محفوظ پا کر لنگر ڈالنے اور رسیوں کی سیڑھی نیچے پھینکنے کا حکم دیا۔ عمر اور ابراہیم
 جہاز پر چڑھ آئے۔ خالد نے زبیر کو دلیپ سنگھ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ کیا،
 جو ابھی تک سمندر میں غوطے کھانے والے دشمنوں پر تیروں کی مشق کر رہے تھے۔

زبیر نے انھیں بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور لیٹرے قدرے مطمئن ہو کر سیڑھی
 کے ذریعے جہاز پر چڑھنے لگے۔ سب سے آخر میں لیٹروں کے سردار کی کشتی دونوں جہازوں
 کے درمیان آکر ٹکی۔ ایک قوی ہیکل اور عمر آدمی جن کی داسھی کے آدھے بال سفید
 ہو چکے تھے، زخمی شیر کی طرح جہاز رانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کشتی میں زبیر کی نظر ایک نوجوان اور ایک لڑکی پر پڑی۔ دونوں شکل و صورت
 اور لباس کے اعتبار سے لیٹروں سے بہت مختلف تھے۔

زبیر نے قوی ہیکل اور بارعب آدمی کو ڈاکوؤں کا سردار سمجھ کر اس کی طرف اشارہ

کیا اور ملال کشتی کو کھیتے ہوئے جہاز کے قریب آئے اور یکے بعد دیگرے رسی کی سیڑھی
 پر چڑھتے ہوئے ادا کر آ گئے۔ لڑکی کے چہرے سے غلاست اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔
 خوش وضع اور خوش پوش نوجوان اس کا بازو پکڑ کر سہارا دے رہا تھا اور وہ سنبھل سنبھل
 کر سیڑھی پر پاؤں رکھ رہی تھی۔

جہاز پر پہنچ کر نوجوان نے ایک اجنبی زبان میں کچھ کہا اور لیٹروں کی طرف گھورتے
 لگا۔ زبیر نے اس کی زبان پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی محسوس کیا کہ وہ لیٹروں کے مظالم
 کی شکایت اور اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

زبیر نے اپنی استطاعت کے مطابق سندھ اور سرانڈیپ کی ملی جلی زبان میں اسے
 تسلی دی۔ نوجوان اور لڑکی اس کے دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کر تشکر آمیز نگاہوں سے اس
 کی طرف دیکھنے لگے۔ لڑکی نے کچھ کہا جابابا لیکن اس کی سہمی ہوئی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی
 وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر زبیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی عمر چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ
 معلوم ہوتی تھی۔ خوبصورت چہرہ دوپہر کے بھول کی طرح کھلایا ہوا تھا۔ زبیر نے پھر ایک
 بار ان دونوں کو تسلی دی سب سے آخر میں ڈاکوؤں کا سردار جہاز پر پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں
 ندامت کے آنسوؤں کی بجائے انتقام کی بجلیاں تھیں۔

تھوڑی دیر میں دلیپ سنگھ اپنے جہاز سے اتر کر کشتی کے ذریعے زبیر کے جہاز
 پر پہنچ گیا اس نے آتے ہی ڈاکوؤں کے سردار کو مارنے کے لیے چابک اٹھایا لیکن زبیر
 نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر کی قمیص کی آستین کو خون آلود دیکھ
 کر پوچھا۔ ”آپ زخمی ہیں؟“

زبیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”یہ معمولی زخم ہے۔“
 خوش پوش نوجوان نے کچھ کہہ کر دلیپ سنگھ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور دونوں ایک
 دوسرے سے باتیں کرنے لگے اس کے بعد دلیپ سنگھ نے ڈاکوؤں کے سردار سے

چند باتیں کرنے کے بعد عربی زبان میں زیر کے ساتھیوں سے کہا۔ ”کشتی میں ایک صندوق پڑا ہوا ہے اسے اوپر لے آؤ۔“

ملاحوں نے صندوق کی کڑی کے چوٹے سے صندوق کو رستے کے ساتھ باندھ کر اوپر کھینچ لیا۔ ولیپ سنگھ نے ڈھلکا اوپر اٹھایا اور تمام ملاح حیران ہو کر سونے موتیوں اور جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کو دیکھنے لگے۔

زیر کے استفسار پر ولیپ سنگھ نے خوش پوش نوجوان سے چند سوالات اور پوچھے اور اس نے اپنی آپ بیتی سنائی۔

(م)

نوجوان کا نام جے رام تھا۔ وہ کاٹھیا واڑ کے ایک عالی نسب راجپوت خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اوائل شباب میں اسے شہرت اور ناموری کا شوق سرزمین سندھ تک لے گیا۔ برہمن آباد کے ایک میلے میں اس نے تیراندازی میں اپنے کمالات دکھا کر سندھ کے راجہ کو اپنا قدردان بنا لیا۔ راجہ نے اسے اپنی فوج میں ایک معمولی عہدہ دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ دو سال کی خدمت گزاری کے بعد جے رام نے دیبل کے نائب حاکم کی جگہ حاصل کر لی۔ دیبل میں آئے ہوئے اسے ایک ہفتہ نہ ہوا تھا کہ گھر سے اسے اپنے باپ کی وفات اور ماں کی علالت کی خبر ملی اور وہ چند ماہ کی رخصت لے کر کاٹھیا واڑ پہنچا۔ گھر پہنچنے کے دس دن بعد اس کی والدہ بھی چل بسی۔ گھر میں اب صرف اس کی ایک چھوٹی بہن مایا دیوی تھی۔ جے رام نے ہشتہ داروں کی نصیحت اور مایا دیوی کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر واپس سندھ جانے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن چار ماہ گھر میں قیام کرنے کے بعد اسے اپنی پرسکون زندگی تلخ محسوس ہونے لگی اور ایک دن اس نے کاٹھیا واڑ کے راجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ملازمت کی درخواست کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ کے راجہ نے اپنا حلقہ اقتدار وسیع کرنے کے لیے پڑوس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر رکھی تھی اور خود مختار سردار اور راجے اسے اپنا طاقتور مہمایہ تسلیم کرنے کے ثبوت میں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اس کی نذر کیا کرتے تھے۔ کاٹھیا واڑ کے راجہ کو اگرچہ براہ راست سندھ کے راجہ سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاہم وہ کچھ سونے اور چاندی کے عوض اسے اپنا دوست بنانا غنیمت سمجھتا تھا۔ جے رام کو اپنے دربار میں کوئی عہدہ دینے کی بجائے اس نے سندھ میں اس کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانا زیادہ مناسب خیال کیا، اور اسے سونے، جواہرات اور موتیوں کا ایک صندوق دے کر سندھ کے راجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ جے رام کو یقین تھا کہ راجہ واپس اسے واپس نہ آنے دے گا۔ اس لیے اس نے اپنی اکیلی بہن مایا دیوی کو گھر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مایا دیوی بھی اس کے ساتھ جانے پر رضہ تھی۔ اس لیے یہ دونوں اپنا گھر بار چھوڑ کر بھائی کے سپرد کر کے سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن کاٹھیا واڑ اور سندھ کے درمیان ان کے جہاز کو بحری ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے ساتھی بہادری سے لڑے لیکن ڈاکوؤں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ ڈاکوؤں نے جواہرات کے صندوق پر قبضہ کر لیا، جے رام اور مایا دیوی کے سوا ان کے باقی ساتھیوں کو سمندر کے کنارے لاکر آزاد کر دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار یہ سمجھتا تھا کہ جے رام اور مایا دیوی راجہ کاٹھیا واڑ کے عزیز ہیں اور وہ ان کی جان بچانے کے لیے ایک معقول رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا اس لیے وہ کاٹھیا واڑ کے ساحل کے غیر آباد حصے پر ٹنگر انداز ہو کر راجہ سے یہ سودا کرنا چاہتا تھا لیکن ان کے ایک جاسوس نے اسے سرائپ کے جہازوں کی آمد کی خبر کر دی، اور اس نے کاٹھیا واڑ ٹھہرنے کی بجائے بلا بار کارخ کیا۔

252

1992

ناہید اور دوسری عرب عورتوں نے دل و جان سے مایا دیوی کی تیمارداری کی یہ بھی بخار کے لیے ناہید سرانڈیپ سے چند بھری بوٹیاں اپنے ساتھ لائی تھی ان کے استعمال سے مایا دیوی تین چار دن میں تندرست ہو گئی۔

زبیر نے اپنے بازو کے زخم کو معمولی سمجھ کر شروع شروع میں چنداں پروا نہ کی لیکن امرطوب ہوا کے باعث زخم میں تیسرے دن پیپ پڑ گئی اور اسے درد کی شدت اور بخار کی وجہ سے چند دن بستر پر لیٹنا پڑا۔

دلیپ سنگھ کی بار اپنا جہاز چھوڑ کر اس کی تیمارداری کے لیے آیا۔ علی، خالد اور ہاشم ناہید اور دوسری عرب عورتوں کو ہر ان اس کی حالت سے باخبر رکھتے تھے۔ جیسے رام ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مایا دیوی ایک عورت کی ذکاوت جس کی بدولت ناہید کے معوم اور پریشان رہنے کی وجہ سمجھ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں کبھی کبھی زبیر کو دیکھ آتی اور واپس اگر اشاروں اور غری کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جنھیں وہ دن رات عرب عورتوں کی صحبت میں رہ کر یاد کر چکی تھی۔ ناہید کو تسلی دیتی۔

ایک شام زبیر کی حالت قدرے بخوش تھی۔ دلیپ سنگھ آیا اور زخم کی مرہم پٹی کرنے کے بعد چلا گیا۔ رات کے وقت مطلع ابر آلود تھا اور ہوا تیز تھی طاح اپنی اپنی جگہ پر متعین تھے۔ جسے رام، خالد اور علی زبیر کی تیمارداری کر رہے تھے۔

عرب عورتیں عشا کی نماز کے لیے اٹھیں اور مایا دیوی اپنے بھائی سے زبیر کا حال پوچھنے چلی گئی۔ جب ناہید نماز سے فارغ ہو کر زبیر کی صحت کے لیے دعا کر رہی تھی خالد نے اگر بتایا کہ زبیر بیہوش ہے تو اسے بڑا برا لگے گا۔

ایک عمر رسیدہ عورت نے کہا: "ہمارے تمام آدمی اندھی کی وجہ سے جہاز پر مصروف ہیں۔ ہمیں ان کے پاس ضرور جانا چاہیے۔"

تمام عورتیں اٹھ کر زبیر کے پاس پہنچیں۔ مایا دیوی نے انھیں دیکھ کر اپنے بھائی

کی طرف اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جسے رام نے کئی راتیں آنکھوں میں کٹی تھیں۔ وہ باہر نکلتے ہی جہاز کے ایک کونے میں لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

اچانک اسی رات کے وقت زبیر کا بخار قدرے کم ہوا، اور ناہید اور مایا دیوی کے علاوہ باقی عورتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خالد اور علی وہیں لیٹ گئے۔ رات کے آخر میں رات کے تیسرے پہر زبیر نے آنکھیں کھولیں اور شمع کی روشنی میں مایا دیوی اور ناہید کو دیکھ کر پوچھا: "آپ یہاں؟ جا میں آرام کر رہی ہوں۔" اس نے کھپکھپا کر کہا:

"ناہید کا مہر چھایا ہوا چہرہ خوشی سے جھک اٹھا اور اس نے سوال کیا: "اور آپ اب کیسے ہیں؟"

بہن! میں اب ٹھیک ہوں۔ مجھے پانی دیتے رہو۔ میں اب بخیر ہوں۔ مایا دیوی نے اٹھ کر فرائض سے پانی کا پیالہ بھرا اور ناہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ ناہید نے ہلچکا تے ہوئے ایک ہاتھ سے زبیر کے سر کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پانی کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ زبیر نے پانی پی کر پھر تکیے پر سر رکھ دیا اور ناہید سے کہا: "ان کے بھائی نے میرے لیے بہت تکلیف اٹھائی۔ وہ اب کہاں ہیں؟"

وہ باہر سو رہے ہیں۔ ناہید نے کہا: "وہ اب بخیر ہیں۔"

"آپ بھی جا کر سوئیں۔ مجھے اب آرام لینا ہے۔ دلیپ سنگھ کے نئے مرہم نے بہت فائدہ کیا ہے۔"

(۵) آپ باخبر رہیں کہ زبیر کی حالت اب

چند دنوں کے بعد زبیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ عربوں کا خلق جسے رام کو بہت متاثر کر چکا تھا۔ زبیر نے اس کا السنہ انتہائی درجے کی عقیدت اور محبت کی حد تک پہنچ چکا

نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ وہ ان ارادوں کے باوجود اٹھ کر عرشے پر چلی جاتی اور ایک طرف کھڑی ہو کر نیکیوں سمندر کی لہروں سے دل بہلانے کی کوشش کرتی لیکن جلد ہی اکتا کر منہ پھیر لیتی اور نمازیوں کی طرف دیکھتی غیر شعوری طور پر اس کی نگاہیں خالد پر مرکوز ہو جاتیں۔ خالد کی وجہ سے اسے دوسرے نمازیوں کا رکوع و سجود پسند آتا۔ نماز کے بعد خالد کے ہاتھ بلند ہوتے دیکھ کر اسے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا طریقہ دکش معلوم ہوتا۔

اسلام کے ساتھ اس کی پہلی دلچسپی اس لیے تھی کہ یہ خالد کا دین تھا۔ عربی زبان وہ اس لیے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ خالد کی زبان تھی۔

اس کی دلچسپی اس لیے تھی کہ یہ خالد کا دین تھا۔ عربی زبان وہ اس لیے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ خالد کی زبان تھی۔

اس کی دلچسپی اس لیے تھی کہ یہ خالد کا دین تھا۔ عربی زبان وہ اس لیے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ خالد کی زبان تھی۔

تھا۔ وہ دبیر سے عرب کے تازہ حالات کے متعلق کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ عربوں کے نئے دین میں انسانی مشادات کے تخیل نے اسے شروع شروع میں بہت پریشان کیا لیکن دبیر کی تبلیغ سے وہ جلد ہی اس بات کا قائل ہو گیا کہ دنیا بھر میں قیام امن کے لیے تمام اقوام کا کسی ایسے دین کو قبول کرنا ضروری ہے۔ جو ہر انسان کو مساوی حقوق دیتا ہو۔ جو تمام انسانوں کو رنگ و خون اور نسل سے نہیں بلکہ اعمال سے پہچانتا ہو۔ ابتدا میں اس نے کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں کی چھوٹ سے پرہیز کیا لیکن چند دن دبیر کی صحبت میں رہ کر اسے چھوٹ اور اچھوت کا امتیاز مضحکہ خیز نظر آنے لگا اور ایک دن وہ اپنی بہن سے مشورہ کیے بغیر دبیر کے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

مایا دیوی میں اپنے بھائی سے بھی پہلے ایک ذہنی انقلاب آچکا تھا اور اس انقلاب کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کی طرح اسلام کی تعلیم سے واقف ہو چکی تھی بلکہ اس کی وجہ غریبوں کا وہ اخلاق تھا۔ جس نے ایک غیور راجپوت لڑکی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ایک اجنبی قوم کے انسانوں کے رحم پر ہے۔ مسلمان ملاح اسے دیکھتے اور آنکھیں جھکاتے۔ پہلے ہی دن وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ ان سب کی نگاہیں اس کے بھائی کی نگاہوں سے مختلف نہیں۔

ناہید کی تیمارداری نے بھی اسے بہت متاثر کیا تھا۔ ان سب سے زیادہ وہ خالد کے طرز عمل سے متاثر تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی نگاہیں اسے دیکھنے اور کان اس کی آواز کو سننے کے لیے بیقرار رہتے اور جب وہ سامنے آتا اسے آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ بے پروائی سے منہ پھیر کر گزر جاتا اور وہ دیر تک اپنے دل کی دھڑکنیں سنتی رہتی۔ کبھی طرح طرح کے خیالات سے پریشان ہو کر وہ اپنے آپ کو کوستی۔

رات کے وقت وہ اپنے ہم عمر لڑکے سے مرعوب ہونے کے بجائے اسے نفرت اور حقارت اور بے پروائی سے دیکھنے کا ارادہ لے کر سوتی لیکن صبح کی اذان کے بعد جب عرب

اس نے جواب دیا۔ ”میرے جہاز غرق ہو چکے ہیں اور اب میں بڑھاپے کے باقی دن کسی جنگل میں چھپ کر گزارنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔“

”ڈاکو ہر جگہ خطرناک بن سکتا ہے۔ تم سمندر میں جہازوں کو لوٹتے تھے۔ خشکی پر لوگوں کے گھروں میں ڈانچے ڈالو گے اگر میں تمہیں بصرہ لے جاؤں تو وہاں غالباً تمہارے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور اگر تمہارا فیصلہ ہے رام پر چھوڑوں تو باقی عمر تمہیں قید خانے کی کوٹھری میں گزارنی پڑے گی۔“

ڈاکوؤں کے سردار نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی حکومت کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دیبل کی حکومت کو مجھے سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ میں گزشتہ چند برس جو کچھ سمندر میں اپنے جہاز پر سوار ہو کر کرتا رہا ہوں۔ وہی کچھ سندھ کا راجہ تخت پر بیٹھ کر کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے اہل کار کمزور اور غریب آدمیوں کو لوٹتے ہیں اور میرے ساتھی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی بجائے صرف بڑے بڑے جہازوں کو لوٹتے ہیں۔ ہمارا پیشہ ایک ہے لیکن نام ہمارے مختلف ہیں۔ میں ایک ڈاکو ہوں اور وہ ایک راجہ۔ اس کی طرح اس کا باپ بھی راجہ تھا لیکن میرا باپ میری طرح ایک ڈاکو نہ تھا۔ میں خود بھی ایک ڈاکو نہ بننا لیکن ظلم نے مجھے ایسا بنا دیا۔ خیر ان باتوں کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ غالب میں اور میں مغلوب۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سندھ کی حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے خود جو سزا چاہیں دے لیں۔“

زبیر نے کہا۔ ”میں تمہاری سرگذشت سننا چاہتا ہوں۔“

ڈاکوؤں کے سردار نے قدرے تاقل کے بعد مختصر الفاظ میں اپنی سرگذشت یوں بیان کی :-

میں ایک گنگو اور اس کی سرگزشت

گنگو اور اس کی سرگزشت

ڈاکوؤں کے سردار کو پابہ زنجیر رکھا گیا تھا۔ ولیپ سنگھ کی ہدایت تھی کہ اس پر کسی قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اسے دونوں دقت کھانا پہنچانے کا کام علی کے سپرد تھا اور علی کو ہر دقت یہ خبر رہتی کہ شاید اس کا پیٹ نہیں بھرا اور ہر کھانے پر بوڑھے سردار کو علی کے اصرار پر ایک دو لقمے زیادہ ہی کھاتے پڑتے۔

زبیر کا سلوک بھی اس کی توقع کے خلاف تھا۔ زبیر دن میں ایک دو دفعہ ضرور اس کے پاس آتا۔ پہلی بار اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی سندھی میں باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ عربی میں بے تکلفی سے بات چیت کر سکتا ہے۔

ایک دن اس نے زبیر سے کہا۔ ”موت کے انتظار میں جینا میرے لیے بہت صبر کرنا ہے۔ اگر آپ مجھ پر رحم نہیں کرنا چاہتے تو میں چاہتا ہوں کہ مجھے جو سزا ملنی ہے جلد مل جائے۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”مجھے تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے لیکن تمہیں اس دقت تک قید سے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو کہ تم آزاد ہو کر پھر یہی پیشہ اختیار نہ کر لو گے۔“

وہ چند سپاہیوں کے ساتھ دریا پر آیا، اور مجھے پار لے جانے کے لیے کہا۔ کشتی پر سوار ہو کر وہ لاجو کو بری طرح گھوڑا رہا تھا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ یہ امیری بیوی ہے۔ وہ بولا: کیسی ماہی گیری لڑکی معلوم نہیں ہوتی تم اسے کہاں سے لائے؟ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن کنارے پر پہنچ کر اس نے مجھے بتایا کہ میں شام تک واپس آجاؤں گا۔ تم اتنی دیر میرا انتظار کرو۔ لیکن وہ شام سے پہلے ہی واپس آگیا اور میں نے اسے دوسرے کنارے پہنچا دیا۔ وہ میرا نام پوچھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ ہمارے گاؤں کے ماہی گیروں کا شکار دیکھنے کے بہانے کہیں کہیں ہمارے گاؤں میں چلا آتا۔ گاؤں کے لوگ اسے اپنے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتا دیکھ کر خوش ہوتے لیکن لاجو نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اس کی نیت درست نہیں۔ وہ میری طرف بہت بری نظروں سے دیکھتا ہے۔

ایک شام لاجو صبح معمول کشتی پر کھانا پکا رہی تھی۔ وہ گھوڑے پر آیا اور مجھ سے کہنے لگا: تمہارے پاس کوئی تازہ شکار ہو تو لاؤ۔ میں نے مختصری دیر پیشتر دو بڑی مچھلیاں پکڑی تھیں۔ وہ میں نے اسے پیش کیں۔ اس نے مجھے مچھلیاں اٹھا کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ شہر دور نہ تھا، اور میں نے لاجو سے کہا: ”میں کھانا تیار ہونے تک آجاؤں گا۔“ میں اس کے گھوڑے کے پیچھے چل رہا تھا کہ راستے میں جھاڑیوں کی آڑ سے چند آدمی نمودار ہوئے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کی لیکن کسی نے میرے سر پر لاٹھی ماری اور میں تیور کر گر پڑا۔ اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تارک کو تھری میں پڑا ہوا تھا۔

(۳۳)

”دو دن میں بھوکا اور پیاسا جان کنی کی حالت میں وہاں پڑا رہا۔ تیسرے دن کو تھری

کے چپلے ریلوے پارک کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں ایک (۲) سالہ لڑکا، لاجو،

”میرا نام گنگو ہے میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی طرح میرا بھی پیشہ ماہی گیری تھا۔ میں سال کی عمر میں میرے سرے والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام لاجو تھی اور وہ بھی لاجو تھی۔ اس کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں سے زیادہ دلفریب اور اس کی آواز گول کی آواز سے زیادہ مسیحی تھی۔ لوگ اسے جل پری کہا کرتے تھے۔ گاؤں میں کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جو لاجو پر جان دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ لیکن وہ صرف مجھے چاہتی تھی اس کا باپ ایک سادہ دل آدمی تھا۔ برسات میں ایک دفعہ دریا زوروں پر تھا، تو اس نے شرط لگائی کہ میں لاجو کی شادی اس کے ساتھ کروں گا جو تیرے دریا عبور کرے گا۔ ہمارے گاؤں میں اچھے اچھے تیراک تھے لیکن برسات میں دریا کا بہاؤ دیکھ کر کسی کو پانی میں کودنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں لاجو کے لیے جان تک قربان کرنے کو تیار تھا۔ میں نے یہ شرط پوری کی اور چند دنوں کے بعد میری اور اس کی شادی ہو گئی۔

ہم دونوں خوش تھے، اور زیادہ وقت کشتی پر گزارتے تھے۔ میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا وہ کھانا پکایا کرتی تھی، رات کے وقت ہم بیٹھ بیٹھتے اور گاتے گاتے، تاروں کی چھاؤں میں سو جاتے۔ عجیب دن تھے وہ بھی۔“

یہاں تک کہ کر گنگو کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دیر تک مچھلیاں لینے کے بعد اس نے پھر اپنی داستان شروع کی:-

”لیکن ایک دن ایسا آیا کہ مجھے لاجو سے جدا ہونا پڑا۔ ہمیشہ کے لیے مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک بیچ ذات اور کمزور آدمی کے لیے ایک خوبصورت بیوی رکھنا پاپ ہے ہمارے گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ہمارے علاقے کے سردار کا شہر تھا۔ ایک دن

تدبیر سوچ سکو۔“

اس کے آنسوؤں اور آہوں نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ میں نے اسے پھر گلے لگایا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں جلد آؤں گا۔ میں اس محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“

تقد خانے کا دروازہ پھر کھلا، سپاہیوں کی بجائے وہ ظالم بھٹیڑا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار نہ ہوتی تو میں یقیناً اس پر حملہ کر دیتا۔ اس نے آتے ہی لاجو سے کہا: ”اب بتاؤ کیا فیصلہ کیا تم نے؟ اس کی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ لاجو نے جواب دیا: ”اگر میں آپ کی شرط مان لوں، تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ زندہ اور سلامت شہر سے نکل جائیں گے؟“ اس نے کہا: ”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

لاجو آنسو بہاتی ہوئی اس کے ساتھ چلی گئی اور مجھے چار سپاہی شہر سے باہر لے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواں تھیں۔ مجھے سردار کے وعدے پر اعتبار نہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر جب ہم اس جنگل میں پہنچے جو دریا کے کنارے دوڑتا تھا تو ایک شخص نے پیچھے سے اچانک مجھ پر وار کیا۔ مجھے پہلے ہی اس حملے کی توقع تھی اس لیے میں نے ایک طرف کود کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس پر چاروں آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن میں بھاگنے میں ان سے تیز تھا میں جلد ہی جنگل میں پہنچ کر ایک جھاڑی کے نیچے چھپ گیا۔ وہ بھٹوڑی دیر ادھر ادھر تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

شام ہو رہی تھی، میں چھپتا چھپاتا دریا کے کنارے پہنچا۔ میری کشتی بل رہی تھی اور دریا کے کنارے وہ چاروں سپاہی کھڑے تھے۔ ان واقعات نے میرے جیسے امن پسند آدمی کو ایک بھٹیڑا بنا دیا۔ میں گاؤں کی طرف بھاگا۔ میری آواز میں ایک اثر

کا دروازہ کھلا اور لاجوئی کے ساتھ تین آدمی جن میں سے ایک کھانا اور پانی اٹھائے ہوئے تھا، اور دو کے ہاتھوں میں ننگی تلواں تھیں، کو بھٹری میں داخل ہوئے۔ لاجو کا رنگ زرد تھا اور اس کی آنکھیں دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کا تمام ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اس کا نگاہ پڑتے ہی بھوک اور پیاس بھول گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اس سے لپٹ جاؤں لیکن میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے لاجو نے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور وہ تلواروں سے میری رسیاں کاٹ کر باہر نکل گئے۔

میں نے پوچھا: ”لاجو! تم یہاں کیسے پہنچیں؟“ اور وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخوں کو ضبط کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی لیکن اچانک اس نے خوفزدہ ہو کر مجھے چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے چلے آنے سے بھٹوڑی دیر بعد چند آدمیوں نے کشتی پر حملہ کیا اور اسے پکڑ کر سردار کے پاس لے آئے اسے میرا حال معلوم نہ تھا اور وہ بے غیرتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دینا چاہتی تھی لیکن سردار نے اسے میری قید کا حال بتا کر یہ دھمکی دی کہ تو اگر اس کے عمل میں بے حیائی کی زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی تو تیرا شوہر اس کو بھٹری میں بھوکا اور پیاسا اڑیاں دگڑا کر مر جائے گا۔ اب وہ میرے پاس آئی تھی، یہ بتانے کے لیے کہ گنگو تم آزاد ہو۔ تم جاؤ اور یہ سمجھو کہ تمہاری لاجو مر گئی۔ وہ اپنی عصمت سے میری آزادی کا سودا کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے غلط سمجھا۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ ایک غریب ملاح کی کشتی چھوڑ کر محلوں میں رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے برا بھلا کہا، گالیاں دیں اور ان ظالم ہاتھوں سے چند تھپڑ بھی مارے لیکن وہ پتھر کی موڑتی کی طرح کھڑی یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اس نے صرف یہ کہا: ”گنگو! میں بے غیرتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی لیکن میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے تمہاری جان اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے بھگوان کے لئے تم جاؤ! یہ موقع نہ گنواؤ۔ ممکن ہے کہ تم آزاد ہو کر مجھے اس ظالم کے پنجے سے چھڑانے کی کوئی

تھا اور ان کی آن میں چند نوجوان لاشیاں اور کلہاڑیاں لے کر میرے ساتھ نکل آئے ہمیں دیکھ کر سپاہی سرسیمہ ہو کر بھاگے لیکن ہم نے کسی کو پچ نکلنے کا راستہ نہ دیا اور چاروں کو مار کر ان کی لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ آدھی رات تک میں نے ماہی گیروں کی بس پچیس بسیوں سے کوئی دو سو جوان اکٹھے کر لیے اور تیسرے پہر سردار کے محل پر دھاوا بول دیا۔ شہر کے لوگ پہلے ہی اس کے مظالم سے تنگ تھے کوئی اس کی مدد کے لیے نہ نکلا۔ اس کے چند سپاہیوں نے مقابلہ کیا لیکن اکثر نے بھاگ کر لوگوں کے گھروں میں پناہ لی۔ ہم نے سردار کو پکڑ لیا اور اس سے لاجو کے متعلق پوچھا وہ ہر سوال پر صرف یہ جواب دیتا تھا۔ ”میں بے قصور ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو میں نے مشعل دکھا کر اسے زندہ جلا دینے کی دھمکی دی تو وہ مجھے محل کی پچلی منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ فرش پر لاجو کی لاش دیکھ کر میری چیخ نکل گئی وہ ہاتھ باندھ کر یہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے اسے نہیں مارا اس نے خود مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ تم سپاہیوں سے پوچھ سکتے ہو۔ بھگوان کے لیے مجھ پر دیا کرو۔“ میں نے حلیتی ہوئی مشعل اس کی آنکھوں میں بھونک دی اور کلہاڑی کی پے درپے ضربوں سے اسے ٹکڑے کر دیے۔

اس کے بعد میں ایک ڈاکو تھا۔ میرے دل میں کسی کے لیے رحم نہ تھا۔ میں نے کئی سرداروں کو لوٹا اور جب راجہ کی فوجوں نے زمین ہمارے لیے تنگ کر دی۔ میں نے دریا کے راستے سمندر کا رخ کیا۔ دیل کی بندرگاہ سے ہم نے رات کے وقت دو جہاز چوری کیے اس کے بعد میں اب تک کئی جہاز لوٹ چکا ہوں۔ میں ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں، جو راجوں اور سرداروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ مجھے ہر دولت مند انسان میں اس سردار کی روح نظر آتی ہے۔ مجھے ہر اونچے ایوان میں لاجوئی جیسی مظلوم لڑکیوں کی روحیں انتقام کے لیے پکارتی سنائی دیتی ہیں۔“

زبیر نے کہا۔ ”مجھے اس لڑکی کی دردناک موت کا سخت افسوس ہے اور سردار نے

جنگ کرنے میں بھی شاید تم حق بجانب سمجھے جاسکو گے لیکن تم ایک انسان کے ظلم کا بدلہ دوسرے انسان سے کیسے لے سکتے ہو؟ تم نے ہمارے جہاز پر حملہ کیا اور اس پر کوئی سردار سوار نہ تھا۔ اس پر چند یتیم بچے اور عورتیں تھیں۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن دوسرے جہاز پر سرانڈیپ کے راجہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور آپ اس کے معاون تھے تاہم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے جہاز پر عورتیں اور بچے سوار ہیں تو میں حملہ نہ کرتا۔ چند ماہ ہوئے میں نے اسی سمندر میں آپ کے ملک کا ایک جہاز دیکھا تھا لیکن میں نے اسے صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ اس پر مردوں کے علاوہ چند عورتیں بھی تھیں۔“

خالہ ریسن کرچلا اٹھا۔ ”کیا اس پر سرانڈیپ کے چند ملاح تھے؟“

”ہاں!“

”وہ تو ابا کا جہاز تھا اور ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں۔ تم جھوٹ کہتے ہو تم ان کا جہاز غرق کر چکے ہو۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”اگر میں اس جہاز کو غرق کر چکا ہوتا۔ تو مجھے آپ کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔“

”اس جہاز پر ہاتھی بھی تھے؟“

”ہاں!“

”تمہیں اس کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غرق ہوا؟“

”نہیں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جہاز دیل تک صحیح سلامت پہنچ گیا تھا۔“

زبیر نے پوچھا۔ ”اس سمندر میں تمہارے سوالیہوں کا کوئی اور گروہ بھی

ہے؟“

”ہاں!“

”کیا ممکن ہے کہ دیل کے حاکم نے وہ جہاز لوٹ لیا ہو؟“

”ہاں! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خشکی کے ڈاکو سمندر کے لیٹروں سے زیادہ

بے رحم ہیں۔“

(۴)

اس گفتگو کے بعد گنگو کے ساتھ زبیر کی دلچسپی بڑھ گئی۔ جسے رام عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ گنگو کی سرگزشت نے زبیر کی طرح اسے بھی متاثر کیا لیکن ایک وفادار سپاہی کی طرح وہ راجہ کو نکتہ چینی سے بلند سمجھتا تھا۔ وہ رعایا کے کسی فرد کا یہ حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ کسی ذاتی رنجش کی بنا پر راجہ کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ وہ راجاؤں کی تقدیس کے مقابلے میں رعیت کی کمتری کا قائل تھا۔ تاہم جب زبیر نے گنگو سے پراسن رہنے کا وعدہ لے کر اس کی زنجیریں کھلوادیں، تو اس نے مزاحمت نہ کی۔

چند دن زبیر کی صحبت میں رہ کر گنگو نے اپنے خیالات میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ زبیر نے چند ملاقاتوں میں روم اور ایران کے خلاف مسلمانوں کی ابتدائی جنگوں کا ذکر کر کے اس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ دنیا میں صرف اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو جبر و استبداد کی حکومتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ گنگو ایک ڈاکو کی زندگی اختیار کرنے کے بعد سماج کے تمام مذہبی عقائد سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ اس کے لیے دنیا ایک وسیع جھیل تھی، جس میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی ہیں، وہ خود کو ایک چھوٹی مچھلی سمجھتے ہوئے ہر بڑی مچھلی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیار تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کی ہمدردی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ وہ روئے زمین کی بڑی مچھلیوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔

ایک دن زبیر نے اسے سمجھایا کہ تم ظلم کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارے ہتھیار اپنے دشمن کے ہتھیاروں سے مختلف نہیں۔ انھوں نے تمہاری کشتی جلائی تھی اور تم ان کے جہاز جلاتے ہو دونوں کا اصول ظلم ہے جس طرح کئی بے گناہ ان کے ظلم کا شکار ہوتے ہیں اسی طرح کئی بے گناہ تمہارے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔ تم خود تسلیم کر چکے ہو کہ تم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ تم دونوں میں کسی کے پاس عدل و انصاف اور امن کے لیے کوئی قانون نہیں۔ اور جب تک تم میں سے ایک کے پاس ایسا قانون نہیں، تمہاری تلواریں آپس میں ٹکراتی رہیں گی ایک تلوار کند ہوگی تو تم دوسری اٹھا لو گے، ایک کمان ٹوٹے گی تو تم دوسری بنالو گے لیکن ظلم کے مقابلے میں حق و انصاف پر لڑنے والے انسان اپنے حریف کی تلوار کند ہی نہیں کرتے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے چھین لیتے ہیں۔ ایران اور روم پر عربوں کی فتح دراصل نظام باطل پر نظام حق کی فتح تھی۔ ظلم پر انصاف کی فتح تھی، ایران مصر اور شام کے وہ لوگ جو کل تک حق پرستوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، آج افریقہ اور ترکستان سے ظلم کی طاقتوں کو مٹانے کے لیے ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔“

گنگو نے متاثر ہو کر پوچھا: ”کیا میں بھی آپ لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں؟“ زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”ایک ڈاکو کی حیثیت سے نہیں۔ ہمارا کام بھٹکے ہوئے قافلوں کو لوٹنا نہیں بلکہ انھیں سلامتی کا راستہ دکھانا ہے وہ انسان جو خود ایک غلط مسلک پر کاربند ہو، ایک صحیح اصول کا علمبردار نہیں ہو سکتا۔“

گنگو نے نادام سا ہو کر کہا: ”اگر میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میں ایک لیٹیرے کی زندگی سے توبہ کرتا ہوں تو آپ مجھ پر یقین کر لیں گے؟“

”میں خوشی سے تم پر اعتبار کروں گا۔“

”اور آپ مجھے آزاد بھی کر دیں گے۔“

زبیر نے جواب دیا: ”اگر تم توبہ کے لیے یہ شرط پیش کرد، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس لیے توبہ نہیں کرو گے کہ تم اپنے افعال پر نادم ہو اور اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہو بلکہ اس لیے کہ تم آزاد ہونا چاہتے ہو۔“

”لیکن میری توبہ سے آپ یہ خیال تو نہیں کریں گے کہ میں بزدل ہوں؟“

”نہیں توبہ کرنا بہت بڑی جرأت کا کام ہے۔“

”تو میں آپ سے ایک ڈاکو کا پیشہ ترک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

”مجھے تم پر یقین ہے اور اگر تم اپنے ساتھیوں کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار

ہو تو میں تم سب کو آزاد کر دوں گا، اور جس جگہ کہو تمہیں اتار دوں گا۔“

گنگو نے جواب دیا: ”میرے ساتھیوں نے صرف میری وجہ سے یہ پیشہ اختیار

کیا تھا۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو میری رہنمائی کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتے

اگر آپ انہیں سندھ کے کسی غیر آباد حصے پر اتار دیں تو پھر مایہ گیروں کا پیشہ اختیار کر

لیں گے وہ مدت سے میرے ساتھ ہیں اور انہیں کوئی پہچانے گا بھی نہیں لیکن ان

میں چار آدمی خود سر ہیں۔ ان کے متعلق میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتا۔ مجھے خود اپنے

اد پر اعتماد نہیں اگر آپ نے مجھے آزاد کر دیا تو ممکن ہے کہ کسی ظالم سردار کو دیکھ کر میں

صبر نہ کر سکوں اور پھر اسی ظلم پر اتر آؤں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں تو ممکن

ہے کہ آپ کے ملک میں رہ کر میں بھی آپ جیسا انسان بن جاؤں۔ وہ چار آدمی جن

کا میں نے ذکر کیا ہے اگر میری طرح اس جہاز پر ہوتے، تو مجھے یقین ہے، کہ

آپ کی باتیں انہیں بھی متاثر کرتی، اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ساتھیوں

سے مل لوں گا۔“

(۵)

اگلے دن یہ جہاز ایک ٹاپو کے کنارے لنگر انداز ہوئے۔ زبیر گنگو کو ساتھ لے کر

دلیپ سنگھ کے جہاز پر چلا گیا۔ گنگو نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سندھی زبان میں ایک

مختصر تقریر کی۔ رہائی کا مترہ سن کر قیدیوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے لیکن جب

گنگو نے یہ بتایا کہ وہ لوٹ مار سے توبہ کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ

چکا ہے تو بعضوں کی خوشی غم میں تبدیل ہو گئی۔ گنگو نے یکے بعد دیگرے سب سے

قسمیں لیں لیکن تین آدمی جن میں سے ایک وہ بھی تھا جس کے آدھے سر اور دالھی

اور مونچھوں پر دلیپ سنگھ کے ساتھی اپنے استروں کی دھار کی آزمائش کر چکے تھے۔

مذہب سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گنگو نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: ”کالو، واسو اور موتی! تم کچھ عرصہ میرے ساتھ رہو گے۔“

اس کے بعد اس نے زبیر سے مخاطب ہو کر کہا: ”میں ان کے پر امن رہنے

کی ضمانت دیتا ہوں۔“ زبیر نے دلیپ سنگھ سے چند باتیں کرنے کے بعد ملاحوں کو قیدیوں

کی زنجیریں کھول دینے کا حکم دیا۔

کالو، واسو، موتی اور گنگو زبیر کے ساتھ دوسرے جہاز پر چلے آئے، واسو کا

عجیب و غریب حلیہ دیکھ کر تمام عرب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ علی نے بے اختیار

ایک قہقہہ لگایا اور عورتوں تک یہ خبر پہنچانے کے لیے بھاگا اور جب واپس آیا تو

اس کے ساتھ ہاشم کے علاوہ چند اور بچے بھی تھے۔ تمام لوگ حیران ہو کر اسے دیکھنے

لگے۔ ہاشم نے آگے بڑھ کر معصومانہ انداز میں پوچھا: ”تمہارے چہرے کے بائیں طرف

بال نہیں آگتے؟“

تمام عرب ہنس پڑے۔ علی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ گنگو نے ہنستے ہوئے ہاشم

کو گرد میں اٹھالیا۔

شک ہے کہ وہ جہاز دیبل کی بندرگاہ کے آس پاس شہر کے حاکم نے
لوٹا ہے۔“

ناہید نے کہا۔ ”میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میرا باپ زندہ ہے۔“
گنگو نے جواب دیا۔ ”اگر وہ زندہ ہے تو سندھ کے کسی ایسے قید خانے میں ہوگا۔
جہاں سے لوگ موت سے پہلے باہر نہیں نکلتے لیکن میں اس کے سماع نگلنے کی ذمہ داری
لیتا ہوں۔ اگر ان کا پتہ مل گیا تو میں مکران کے حاکم کے پاس اطلاع بھیج
دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ ”آپ مجھے دیبل کے آس پاس اتار دیں
اور جے رام اگر میری مدد کرے تو میں بہت جلد ان کا پتہ لگا سکوں گا۔“

مایا دیوی نے کہا۔ ”میں اپنے بھائی کی طرف سے تمہاری مدد کا وعدہ کرتی ہوں۔
دیبل کا حاکم ان کا دوست ہے اور وہ ان سے کوئی بات نہیں چھپائے گا۔“

گنگو نے کہا۔ ”حاکم کسی کے دوست نہیں ہوتے اور دیبل کے حاکم کو تو میں
اچھی طرح جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ ”آپ دیبل کی بندرگاہ پر
ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”میرا تو ارادہ نہ تھا لیکن جے رام کے مجبور کرنے پر میں ایک
دو دن ٹھہرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔“

گنگو نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ سندھ کے راجہ اور دیبل کے
حاکم پر جے رام کا کتنا اثر ہے۔ ورنہ میں آپ کو سندھ کے ساحل پر اتارنے کا مشورہ
نہ دیتا۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”ہمارے ساتھ سندھ والوں کے تعلقات اس قدر بے
نہیں پچھلے دنوں ابوالحسن کے متعلق پوچھنے کے لیے والی مکران دہاں گیا تھا جہاں

شام کے وقت خالد نے زبیر سے کہا۔ ”ناہید کا خیال ہے کہ گنگو کو اباجان کے
جہاز کا ضرور علم ہوگا۔ وہ بذاتِ خود گنگو سے چند سوالات پوچھنے پر اصرار کر رہی
ہے۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں ہیں گنگو کی باتوں پر اعتبار کرنا چاہیے۔“
خالد نے کہا۔ ”لیکن ناہید یہ کہتی ہے کہ اگر اسے علم نہ بھی ہوا تو بھی وہ پستہ
لگانے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ کل انہیں کوئی خواب نظر آیا تھا اور وہ یہ کہتی ہیں
کہ اباجان زندہ ہیں۔“

”پوچھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ وہ گنگو پر کوئی شک و شبہ ظاہر نہ
کریں۔ جاؤ اپنی بہن کو لے آؤ، میں گنگو کو بلاتا ہوں۔“

دلیپ سنگھ نے گنگو کو بلایا اور ناہید کے ساتھ مایا دیوی بھی آگئی۔ ناہید کے چہرے
پر ایک سیاہ نقاب تھا۔ اس نے مایا دیوی کے کان میں کچھ کہا، اور مایا دیوی کے اثبات
میں سر ہلانے پر اپنا ہار اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

مایا دیوی نے ہار گنگو کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے چند دن قبل ان
کے باپ کے جہاز کا ذکر کیا تھا۔ اگر آپ ان کے باپ کا پتہ لگا سکیں تو یہ آپ کا
انعام ہے۔“

گنگو نے رنج و ذمات سے ابدیدہ ہو کر یکے بعد دیگرے خالد اور زبیر کی طرف دیکھا
اور پھر ناہید سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بیٹی! میں اتنا گرا ہوا نہ تھا!“

ناہید نے اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر کہا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مجھے آپ
پر شک نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ہماری مدد کریں۔“

”اس کے لیے مجھے ہار دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں زبیر کے احسان کا بدلہ
نہیں اتار سکتا۔ اگر کوئی لیٹرا اس جہاز کو لوٹتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا لیکن مجھے

اس کے ساتھ فرود سے ضرور پیش آیا لیکن اس پر دست درازی نہیں کی۔
گنگو نے جواب دیا: ”اس کا جہاز خالی ہوگا لیکن آپ کے جہاز پر ہاتھی ہیں اور
وہ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے ہاتھیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس
کے علاوہ آپ کے ساتھ عورتیں ہیں۔ جن کے لیے اس کے دل میں کوئی
عزت نہیں ہے۔“

دبیل

گنگو، کالو، داسو اور موتی کے علاوہ باقی تمام قیدی دبیل سے چند کوس دور ایک
غیر آباد مقام پر اتار دیے گئے۔ گنگو، ابوالحسن کا سراغ لگانے کا بیڑا اٹھا چکا تھا، اس لیے
اس نے ایک گجراتی تاجر کے بھیس میں اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ دبیل کی بندرگاہ
پر اترنے کا فیصلہ کیا۔ جے رام اس مہم میں گنگو کی مدد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ تاہم اس نے
زیر کو بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ حکومت سندھ ایسا نہیں کر سکتی اگر ابوالحسن
کا جہاز دبیل کے آس پاس لوٹا گیا ہے تو دبیل کے حاکم اور راجہ کو یقیناً اس کی
خبر نہیں ہوگی۔

زیر نے جواب دیا: ”مجھے خود یہ شبہ نہیں۔ لیکن میں ناہید کے شبہات دور کرنا چاہتا
ہوں۔“

شام سے کچھ دیر پہلے یہ جہاز دبیل کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے، مایا دیوی نے تمام
عرب عورتوں کو اپنے گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ جے رام نے تمام ملاحوں کو دعوت دی۔
لیکن گنگو نے دبیل سنگھ کے کان میں کچھ کہا، اور اس نے جے رام کو مشورہ دیا: ”آپ
کئی ماہ کے بعد دبیل واپس جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی جائے قیام پر کسی اور کا قبضہ

کہ وہ اچھی طرح مسلح ہیں۔ وہ بندرگاہ سے روانہ تو نہیں ہو گئے؟
 ”نہیں! میں مسافروں کو اپنے پاس ایک دودن مہمان رکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے
 مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کو ان کے شہر میں ٹھہرنے
 پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”اعتراض! نہیں۔ وہ باقی تمام عمر ہمارے مہمان رہیں گے۔ میں مہاراج سے ان
 کے جہاز لوٹنے اور انہیں گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کر چکا ہوں۔“
 اگر اس محل پر بجلی گر پڑتی، تو بھی شاید جے رام اس قدر بدحواس نہ ہوتا وہ ایک
 لمحہ کے لیے ایک بے جان مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے سنبھل
 کر کہا۔ ”آپ مذاق کرتے ہیں؟“

پرتاپ رائے نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں بچوں کے ساتھ مذاق کرنے
 کا عادی نہیں۔ ہمیں سندھی تاجروں سے ان جہازوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور
 مہاراج کا حکم یہی ہے کہ ان جہازوں کو چھین لیا جائے مہاراج تحائف کا یہ صندوق کیفے
 سے زیادہ اس بات سے خوش ہوں گے کہ آپ مال و متاع سے بھرے ہوئے دو جہاز
 یہاں لے آئے ہیں۔“

جے رام نے چلا کر کہا۔ ”نہیں! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ وہ
 میرے دوست اور محسن ہیں۔“

پرتاپ رائے نے ڈانٹ کر کہا۔ ”ہوش سے بات کرو۔ تمہیں معلوم نہیں تم کہاں
 کھڑے ہو؟“

جے رام نے کہا۔ ”یہ انسانیت کے خلاف ہے تم ایک ایسی قوم کی دشمنی مول لو
 گے جو سندھ جیسی کئی سلطنتیں پاؤں تلے روند چکی ہے۔ مہاراج کو اس قسم کا مشورہ دینے
 والے نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں جاتا ہوں۔ مہمان کی رکھشا ایک راجپوت

ہو یہ بھی ممکن ہے کہ دیبل کا حاکم انہیں شہر میں جانے کی اجازت دینے میں کوئی عذر پیش
 کرے۔“

جے رام نے جواب دیا۔ ”اسے کیا عذر ہو سکتا ہے وہ خود آپ کا میزبان بننے پر
 اصرار کرے گا۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو کاٹھیاواڑ کے پیش قیمت تحائف راجہ
 کے پاس نہ پہنچ سکتے۔ اب تو راجہ پر بھی آپ کا حق ہے۔“
 زبیر نے جواب دیا۔ ”آپ شہر کے گورنر سے مل آئیں۔ پھر ہمیں آپ کے ساتھ
 چلنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

اما دیبل نے کہا۔ ”بھیا! آپ جائیں۔ اگر آپ کے مکان پر کوئی اور قابض ہوا۔
 تو یہ بہت بری بات ہوگی۔ آپ مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کرائیں۔ میں اتنی دیر بہن
 ہمید کے پاس ٹھہروں گی۔“

جے رام نے بندرگاہ سے ایک آدمی بلا کر اسے تحائف کا صندوق اٹھانے کا حکم
 دیا اور سیدھا دیبل کے گورنر پرتاپ رائے کے محل میں چلا گیا۔ پرتاپ رائے نے کاٹھیاواڑ
 کے تحائف کے ذکر کے سوا اس کی باقی سرگزشت بے توجہی سے سنی لیکن جب اس
 نے یہ بتایا کہ اسے ڈاکوؤں سے بچا کر یہاں پہنچانے والے سرانڈیپ کے جہاز ہیں تو
 اس نے چونک کر سوال کیا۔ ”کیا یہ جہاز وہی تو نہیں جن پر سرانڈیپ کے راجہ نے عربوں
 کو ہاتھی بھیجے ہیں؟“

”ہاں! لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟“

”یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو! اس پر عرب بچے اور عورتیں

بھی ہیں؟“

”ہاں!“

”یہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے دو جہازوں کو ڈبو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔“

میں زبیر سے رخصت ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی انہیں پندرہ بیس سوار اور ان کے پیچھے قریباً ڈیڑھ سو پیدل سپاہی بندرگاہ کا رخ کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ گنگو کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سوار اور پیدل گزر گئے تو گنگو نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”شہر کا سردار مسلح سپاہی لے کر بندرگاہ کی طرف جا رہا ہے۔ ان کی رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“

کالونے کہا: ”اگر وہ واقعی کسی بری نیت سے جا رہے ہیں تو ہم لوٹ کر کیا کر سکتے ہیں انہیں تو جہازوں کے لنگر اٹھانے اور بادبان کھولنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔“

گنگو نے کہا۔ اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن میں ضرور جاؤں گا۔ اور واسو، موتی، تم بھی اگر چاہو تو جا سکتے ہو۔“

ان دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”نہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

کالونادام سا ہو کر بولا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ گنگو نے جواب دیا۔ ”یہ ہم وہاں پہنچ کر دیکھیں گے۔“

موتی نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ جے رام نے اپنے محسنوں کو دھوکا دیا ہے۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے لیکن اگر اس کی نیت بری ہوتی تو اپنی بہن کو وہاں کیوں چھوڑ جاتا۔“

واسو نے کہا۔ ”یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ وہ اپنی بہن کو اس لیے ان کے پاس چھوڑ گیا تھا کہ وہ اس کے جانے کے بعد بندرگاہ پر ٹھہرنے کا ارادہ تبدیل نہ کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی بھی اس سازش میں شریک تھی۔ دیکھنے میں وہ کتنی بھولی بھالی ہے وہ جہاز پر اس عزت لڑکی کو اپنی بہن کہا کرتی تھی۔“

کا دھرم ہے۔“

”راجہ کے باغی ہو کر تم کہیں نہیں جا سکتے“ یہ کہتے ہوئے پرتاپ رائے نے پہرہ داروں کو آواز دی اور ان کی آن میں چار سپاہیوں نے ننگی تلواروں سے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

جے رام کو اپنی تلوار بے نیام کرنے کا موقع نہ ملا۔ پرتاپ رائے نے کہا۔ ”تمہیں کچھ دیر میری قید میں رہنا پڑے گا۔ بندرگاہ سے واپس آ کر میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ کل تمہیں مہاراج کے پاس روانہ کر دیا جائے گا۔ اگر تم اپنے مہمانوں کی جاں بخشی کروا سکو، تو میں انہیں رہا کر دوں گا لیکن تمہاری خوشی کے لیے میں راجہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔“

سپاہیوں نے جے رام کو محل کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ جے رام دروازے کو دھکے دینے، دیواروں سے سر پٹنے اور شور مچانے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی بہن کا خیال آیا، اور وہ پھر اٹھ کر دروازے سے ٹکریں مارنے لگا۔ اس نے تلوار نکالی لیکن مضبوط کوار پر چند ضربیں لگانے کے بعد وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے پھل کی نوک اٹھا کر اپنے سینے میں گھونپنے کا ارادہ کیا لیکن کسی خیال نے اس کا ہاتھ روک لیا وہ اٹھ کر بیکراہی سے کوٹھری میں ٹپٹنے لگا۔ پھر اسے ایک خیال آیا اور اس نے پہرہ داروں کو آوازیں دیں۔ انہیں طرح طرح کے لالچ دیے لیکن کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ دی۔ اس نے راجہ کے پاس شکایت کرنے کی دھمکیاں دیں، لیکن جواب میں پہرہ داروں کے تہمتے سنائی دیے۔

(۲)

جے رام کے شہر جانے سے کچھ دیر بعد گنگو اور اس کے تین ساتھی شام کے دھند

لے کر کیوں آیا ہے لیکن مجھے جے رام سے فریب کی توقع نہیں۔ اس کی بہن اس جہاز پر ہے۔“

ایلی نے پھر پوچھا: ”میں مہاراج کے پاس کیا جواب لے جاؤں؟“

زبیر نے کہا: ”ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔“

زبیر اور دلیپ سنگھ کشتی میں سوار ہو کر ساحل پر پہنچے۔ دلیپ سنگھ پر تپائے کے سامنے جھک کر آداب بجالایا، لیکن زبیر کی گردن میں خم نہ آنے پر پر تپائے نے کہا: ”تو تم غرب کے باشندے ہو۔ تم میں سے کسی کو بڑوں کا ادب کرنا نہیں آتا؟“

دلیپ سنگھ نے جواب دیا: ”ان کے مذہب میں انسان کے آگے جھکنا پاپ ہے۔“

پر تپائے نے جواب دیا: ”ہمارے پاس رہ کر اسے انسانوں کے سامنے جھکنا بھی آجائے گا۔“

دلیپ سنگھ نے پوچھا: ”آپ کا مطلب؟“

پر تپائے نے جواب دیا: ”کچھ نہیں تمہارے جہازوں پر کیا ہے؟“

دلیپ سنگھ نے کہا: ”جے رام نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ آپ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟“

”جے رام نے جو کچھ بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ جہاز یہاں سے نہیں جاسکتے۔“

”جہاز یہاں سے نہیں جاسکتے۔ وہ کیوں؟“

”یہ راجہ کا حکم ہے۔“

دلیپ سنگھ نے چاروں طرف دیکھا، زبیر اور اس کے گرد مسلح سپاہیوں کا گھیرا

تنگ ہو چکا تھا۔ اس نے عربی زبان میں زبیر کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور زبیر

کے سمجھانے پر وہ پر تپائے سے مخاطب ہوا:۔

گنگو نے کہا: ”اور جے رام خالد کو چھوٹا بھائی کہا کرتا تھا اور جب زبیر بیمار تھا۔ وہ دن رات اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ جھوٹا۔ مکار، دغا باز، اکاش وہ میرے ہاتھ پڑ جائے لیکن وہ لڑکی۔۔۔ کالو وہ ہمارے ہاتھ سے نہ جائے اسے پکڑ کر ہم بہت سے کام نکال سکتے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔ یہ باتوں کا وقت نہیں۔“

گنگو اور اس کے ساتھی پوری رفتار سے بندرگاہ کی طرف بھاگنے لگے۔

(۳)

عرب لاج جہاز پر نماز مغرب ادا کرنے کے بعد دعا کر رہے تھے کہ دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز سے ان کے جہاز پر پہنچ کر انہیں بندرگاہ کی طرف متوجہ کیا۔ زبیر اور اس کے ساتھی ساحل پر مسلح سپاہی دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ چار آدمی ایک کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر پہنچے اور ان میں سے ایک نے سندھی زبان میں کہا: ”دیل کے حاکم سردار پر تپائے آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہیں وہ ان جہازوں کے افسروں سے ملنا چاہتے ہیں۔“

دلیپ سنگھ نے پر تپائے کے پیام رساں سے پوچھا: ”لیکن جے رام کہاں ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”وہ مہاراج پر تپائے سے مل کر آپ لوگوں کی دعوت کا انتظام کرنے کے لیے اپنی قیام گاہ پر چلے گئے ہیں۔ مہاراج خود آپ کے استقبال کے لیے آئے ہیں۔“

دلیپ سنگھ نے زبیر سے عربی میں کہا: ”یہ ضرور کوئی فریب ہے لیکن ہمارے لیے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

زبیر نے جواب دیا: ”میں خود حیران ہوں کہ دیل کا حکمران اتنے سپاہی ساتھ

اٹھی، لیکن پیچھے سے ایک مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیں ہو کر رہ گئی۔
 ”کون؟ گنگو!“ اس نے چاند کی دھیمی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! میں ہوں۔ کالو! اٹھالو اسے، اگر شور مچائے تو گلا گھونٹ دینا۔“
 کالو مایا دیوی کو اٹھا کر جہاز کی پچھلی طرف سی کی ایک سیڑھی سے اتر کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔

گنگو نے آگے بڑھ کر خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”اب مقابلہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے اور عقب سے بھی دو جہاز ہم پر حملہ کرنے آئے لیے آ رہے ہیں۔ میری کشتی جہاز کے پیچھے کھڑی ہے۔ میں تمہیں اور ناہید کو بچا سکتا ہوں۔“

خالد نے بے پردائی سے جواب دیا۔ ”ہم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“

”لیکن تم نہیں جانتے کہ وہ لوگ تمہاری بہن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔“
 ”لیکن میں جہاز کی تمام عورتوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں، اب جے رام کی دغا بازی سے مجھے کسی پر اعتماد نہیں رہا۔“
 ایک تیرناہید کو لگا اور وہ پسلی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ خالد نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا: ”میں ٹھیک ہوں۔ خالد! تم میری نمونہ کرو۔“

خالد نے اس کے اصرار کے باوجود اسے اٹھا کر ہاشم کے قریب بٹھا دیا، ہاشم کی لاش دیکھ کر ناہید کو اپنا زخم بھول گیا۔ اس نے ہاشم کو جھنجھوڑا، آوازیں دیں اور انتہائی کرب کی حالت میں بولی۔ ”ہاشم تم اوپر کیوں آئے؟“
 گنگو نے بے خبری کی حالت میں ناہید کی پسلی سے تیر نکال کر پھینک دیا اور دھاوا

سے کہا: ”اسے اٹھالو!“
 داسوناہید کو اٹھانے کے لیے جھکا لیکن خالد نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا: ”تم جے رام اور یہ سپاہی مختلف راستوں سے آئے تھے لیکن تم سب کا مقصد ایک ہے۔ جاؤ ہم تمہیں ایک دفعہ معاف کر چکے ہیں۔“
 گنگو نے کہا: ”بیٹا! اگر باتوں کے لیے وقت ہوتا، تو میں تمہارا شک دور کرنے کی کوشش کرتا لیکن ہم پر دشمن پر گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور اگر ہم نے چند اور لمحات ضائع کر دیے تو بھاگنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ افنوس میں تمہیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں دے سکتا۔ بیٹی! مجھے معاف کرنا۔“ یہ کہتے ہوئے گنگو نے اچانک ایک چھوٹا سا ڈنڈا خالد کے سر پر دے مارا۔ خالد لڑکھڑایا لیکن گنگو نے اٹھا کر اسے کندھے پر رکھ لیا۔ داسونے ناہید کو اٹھالیا اور گنگو نے موتی سے کہا: ”تم یہ کانیں اٹھالو، یہ ہمیں کام دیں گی۔“

حملہ آور کمندیں ڈال کر جہازوں پر سوار ہو رہے تھے اور تیروں کی لڑائی تنواروں کی لڑائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس ہنگامے میں کسی کو ناہید خالد اور مایا دیوی کے اغوا کیے جانے کا پتہ نہ چلا۔ جب تک یہ لوگ کشتی پر سوار ہوئے، چند کشتیاں عقب سے بھی جہازوں کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ گنگو اور اس کے ساتھیوں نے سندھی زبان میں ہاؤ ہو کر کہنے حملہ آوروں کو شک نہ ہونے دیا اور بچتے بچاتے جہازوں سے ایک طرف نکل گئے۔

گنگو کے کہنے پر مایا دیوی نے اپنا دھپڑ پھاڑ کر ناہید کے زخم پر پی بانڈ دی خالد کو اپنے ساتھ دیکھ کر اب اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ گنگو پانی سے کپڑا جھگو جھگو کر خالد کے ماتھے پر رکھ رہا تھا اور مایا دیوی کو وہ شخص جو چند لمحے پیشتر ایک بدترین دشمن کی صورت میں نمودار ہوا تھا ایک ٹکسار نظر آ رہا تھا۔

کشتی خطرے کی حد سے دور اچکی تھی اور مایا گنگو سے ہم کلام نہ ہونے کا ارادہ کرنے کے باوجود بار بار یہ پوچھ رہی تھی۔ ”اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ یہ کیسے بیہوش ہوا؟“

ناہید انتہائی رنج و ملال کی وجہ سے کسی سے ہم کلام نہ ہوئی۔ وہ تشویش کی حالت میں اپنے بھائی کی طرف دیکھتی اور جب گنگو یہ کہتا۔ ”بیٹی! تم فخر نہ کرو تھکے بھائی کو ابھی ہوش آجائے گا۔ میں تمہارا دشمن نہیں۔ میں سمندر کے دیوتا کی قسم کھاتا ہوں تو ناہید خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔“

پھر وہ مایا دیوی سے مخاطب ہوا۔ ”مایا! تم ایک راجپوت لڑکی ہو۔ راجپوت جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا تمہیں یہ شک تھا کہ تمہارا بھائی ان لوگوں کو دھوکا دے گا۔“

”نہیں! نہیں! میرا بھائی ایسا نہیں۔ میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں۔“

”اور اگر یہ ثابت ہو گیا تو؟“

”تو میں..... میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گی۔ آگ میں جل جاؤں گی۔ اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالوں گی۔ بھگوان کے لیے ایسا نہ کہو“ مایا دیوی کی ہچکیوں نے ناہید کو متاثر کیا اور اس نے کہا۔ ”مایا! تم ان باتوں کی پروا نہ کرو۔ مجھے تم پر یقین ہے اور اگر تمہارے بھائی نے ہمارے ساتھ دھوکا بھی کیا ہو تو اس میں تمہارا کیا قصور؟“

”میں پھر کہتی ہوں میرا بھائی ایسا نہیں۔ اس کی رگوں میں ایک راجپوت کا خون ہے وہ اس قدر احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔“

ناہید نے کہا۔ ”اس وقت ہمارا دشمن وہ ہے جس نے ہمیں زبردستی جہاز پر سے اتارا ہے اور ہمیں کسی نامعلوم جگہ پر لے جا رہا ہے۔“

گنگو نے کہا۔ ”بیٹی! کاش میں تمام بچوں اور عورتوں کو اپنے ساتھ لاسکتا لیکن اس کشتی پر صرف اتنی سوار یوں کی جگہ تھی۔ تم نوجوان ہو اور میں تمہیں ایک بے رحم دشمن کے ہاتھوں سے بچانا چاہتا ہوں اور مایا دیوی! تم شاید باقی سب کو بچا سکو۔ میں تمہاری آزادی کے بدلے باقی لوگوں کو آزاد کرانا چاہتا ہوں۔“

خالد نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا۔ گذشتہ واقعات یاد آتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہنسنے لگا۔ ”ہمارا جہاز کہاں ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ گنگو! گنگو! ظالم! دغا باز فریبی! تم نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ وہ کیا کہیں گے۔ تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“

گنگو نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا۔ ”خالد! یہ میری عمر میں پہلا موقع ہے کہ مجھے کسی کی گالی پر غصہ نہیں آیا۔ تم مجھے جوجی میں آئے کہو لیکن میں نے برا نہیں کیا۔ میں صرف مایا کو لینے آیا تھا لیکن تمہاری بہن کو زخمی دیکھ کر یہ گوارا نہ کر سکا کہ اسے دشمن کے رحم پر چھوڑ دوں۔“

خالد نے حقارت سے مایا دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اب سمجھا جے رام نے ایک طرف سے ہم پر حملہ کرنے کے لیے سپاہی بھیج دیے اور دوسری طرف سے تمہیں مایا دیوی کو لینے کے لیے بھیج دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لیٹروں کے سردار تم نہ تھے جے رام تھا۔“

”تم درست کہتے ہو لیکن میں تو بہ کر چکا ہوں اور جے رام نے تو بہ نہیں کی۔“

”ممکن ہے وہ اپنی بہن کی خبر سننے کے بعد تو بہ کرے۔“

”تو تم ہمیں اس کے پاس نہیں لے جا رہے ہو۔“

”تم دیکھ سکتے ہو بندرگاہ کس طرف ہے اور ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“

”تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟“

”کسی ایسی جگہ جہاں راجہ کے سپاہی نہ پہنچ سکیں“
 خالد نے کہا۔ ”اگر تمہاری نیت بری نہیں تو ہمیں اپنے ساتھیوں کے پاس چھوڑ
 آؤ۔“
 گنگو نے کہا۔ ”تمہارے ساتھی تھوڑی دیر میں دریل کے قید خانے میں ہوں گے
 تم قید ہونے کی بجائے قید سے باہر رہ کر ان کی زیادہ مدد کر سکتے ہو۔“
 خالد نے قدرے پرامید ہو کر پوچھا۔ ”تم سچ پچ ان کی مدد کرنا چاہتے ہو؟“
 گنگو نے جواب دیا۔ ”بیٹا! مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی
 اگر میں تمہارا دشمن ہوتا تو یقیناً اس قدر جھنڈ بے دل سے یہ گالیاں نہ سنتا۔“
 اگلے دن یہ کشتی دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئی۔ گنگو کو اپنے ساتھی مچھلیاں
 پکڑتے ہوئے مل گئے۔

”یہ کون سا علاقہ ہے؟“
 خالد نے پوچھا۔
 گنگو نے جواب دیا۔ ”یہ علاقہ راجہ کے سرکاری علاقہ ہے۔“
 خالد نے کہا۔ ”اگر میں یہاں رہتا تو میں بھی یہاں رہتا۔“
 گنگو نے کہا۔ ”یہاں رہنا بہتر ہے۔“

قیدی

اگلے دن کو ٹھہری کا دروازہ کھلا، اور پریدار نے جے رام کو ہاتھ باندھ کر پرنام
 کیا اور کہا۔ ”آپ کو سردار پر تاپ راتے بلاتے ہیں۔“

جے رام پریدار کے طرز عمل میں اس تبدیلی پر حیران تھا وہ چپکے سے اس کے
 ساتھ ہو لیا۔ پر تاپ راتے اپنے دیوان خانے کے برآمدے میں آنسو کی ایک کڑی
 پر مٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چاندی کے ایک طشت میں سراندیپ کے راجہ
 کے وہ تحائف پڑے ہوئے تھے، جو گزشتہ شام عربوں کے جہاز سے لوٹے گئے
 تھے۔

اس نے جے رام کو دیکھتے ہی جواہرات کے انبار کی طرف اشارہ کیا اور کہا
 ”جے رام! مہاراج سراندیپ کے تحائف دیکھ کر کاٹھیا وار کے راجہ کے تحائف
 کی نسبت زیادہ خوش ہوں گے۔ ان میں ایک ایک ہیرا تمہارے صندوق کے
 سارے مال سے زیادہ قیمتی ہے۔“

جے رام نے اس پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

پر تاپ راتے نے کہا۔ ”لیکن تمہارا چہرہ زندہ اور تمہاری آنکھیں سرخ ہیں۔“

جب چاہیں گے آپ کا گلا دلو پھیل لیں گے۔“
 پرتاپ رائے کو معلوم تھا کہ بعض اوقات راجہ کے غلط احکام بجالانے کا
 خمیازہ اہلکاروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حاکم خطرے کے وقت اپنا قصور اہلکاروں
 کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ عربوں کے متعلق وہ اپنے راجہ کی طرح مطمئن تھا لیکن
 وہ کاٹھیا دار کے سفیر کی بہن کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے کہا: ”جیسے رام
 مجھے تمہاری بہن کے متعلق کوئی علم نہیں۔“
 ”آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں اسے جہاز پر عرب عورتوں کے پاس چھوڑ
 آیا تھا۔“

”عورتیں جو جہاز پر تھیں وہ سب ہماری قید میں ہیں۔ اگر تمہاری بہن ان میں
 ہے تو میں ابھی تمہارے ساتھ چل کر اس سے معافی مانگتا ہوں۔ چلو!“
 بہن کو تلاش کرنے کی خواہش تھی جسے رام کے تمام ارادوں پر غالب آگئی،
 اور وہ پرتاپ رائے کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے پوچھا: ”عرب ملاحوں
 کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا؟“
 پرتاپ رائے نے جواب دیا: ”وہ سب آخری وقت تک لڑتے رہے۔ عورتوں
 اور بچوں کے علاوہ ہم صرف پانچ آدمیوں کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔
 دوسرے جہاز پر سرانڈیپ کے ملاحوں نے معمولی مزاحمت کی لیکن جلد ہی ہتھیار ڈال
 دیے۔“

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بیک وقت سرانڈیپ اور عرب کی خلاف ورزی
 جنگ کر دیا ہے۔“
 ”میں نے صرف راجہ کے احکام کی تعمیل کی ہے اور جب تک میں اس عہدے
 پر ہوں، میں ایسے احکام کی تعمیل کرتا رہوں گا۔ میرے خط کے جواب میں راجہ نے اگر

معلوم ہوتا ہے تم رات بھر نہیں سوئے۔ کوٹھری میں بہت گرمی ہوگی۔ بندرگاہ سے
 واپس آکر مجھے تمہارا خیال نہ آیا۔ ورنہ تمہیں اتنی دیر وہاں رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں
 نے مہاراج کی خدمت میں ایچی بھیج دیا ہے۔ چند دنوں تک قیدیوں کے متعلق ان
 کا حکم آجائے گا۔“

جے رام نے کہا: ”تو آپ نے انہیں قید کر لیا؟“
 ”ہاں! میں نے تمہیں کل بھی بتایا تھا کہ یہ راجہ کا حکم ہے۔“
 ”آپ نے انہیں لڑکر قید کیا یا میزبان بن کر؟“
 پرتاپ رائے نے جواب دیا: ”تم ابھی بچے ہو۔ لڑائی میں سب کچھ جا رہا ہے۔“
 ”میری بہن کہاں ہے؟“
 ”کون؟“

”میری بہن۔“
 ”کہاں تھی؟“
 ”آپ مجھے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ایک راجپوت کی عزت پر ہاتھ ڈالنا
 اس قدر آسان نہیں جس قدر آپ سمجھتے ہیں۔ میں پہلے آپ کے راجہ کا ملازم تھا
 اور اب میں کاٹھیا دار کے راجہ کے سفیر کی حیثیت میں یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ نے
 میری بہن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو یاد رکھیے میں کاٹھیا دار سے لے کر
 راجپوتانہ تک آگ کی دیوار کھڑی کر دوں گا اور مہاراج اپنے ہزاروں سپاہیوں کی
 جانیں ضائع کرنے کے بجائے دیبل کے ایک مغرور حاکم کو ہمارے حوالے کر دینا
 زیادہ مناسب سمجھیں گے۔ رہے عرب وہ مہمان تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ
 میری وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان کے متعلق میری پکا
 ہندوستان کے کسی گوشے میں نہ سنی جائے لیکن ان کے بازو بہت لمبے ہیں۔ وہ

تم نے اپنی بہن کو جہاز پر چھوڑا تھا۔ تمہاری تدبیر کامیاب تھی۔ تم نے اپنے اس حلیف کو ہمارا میزبان بنا کر بھیجا اور مجھے جہاز سے بلوایا اور خود پیچھے سے جہاز پر پہنچ کر نہ معلوم کس بہانے سے ناہید کو کہیں لے گئے لیکن اگر صلح اور جنگ کے لیے تم لوگوں کے اصول یہی ہیں تو یاد رکھو کہ تمہارے راجہ کے دن گئے جا چکے ہیں۔

پرتاپ رائے نے اچانک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا چھین کر زبیر کے منہ پر دے مارا اور دوسری ضرب کے لیے تیار تھا کہ جے رام نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پرتاپ رائے نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”تم راجہ کی توہین برداشت کر سکتے ہو، میں نہیں کر سکتا۔“

جے رام نے کہا: ”میں تم سے آخری بار پوچھتا ہوں کہ میری بہن اور اس عرب لڑکی کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟“

اس سوال نے پرتاپ رائے کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا: ”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے حملے کے وقت اسے انتقامی جذبے کے ماتحت جہاز سے نیچے پھینک دیا گیا ہو۔“

جے رام نے جواب دیا: ”یہ لوگ دشمنی میں شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے میری بہن کے ساتھ عرب لڑکی کا غائب ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سازش کی تہ میں کسی تمہارے جیسے کینے آدمی کا دماغ کام کر رہا ہے۔“

زبیر نے پھر جے رام سے مخاطب ہو کر کہا: ”تم ان باتوں سے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ ناہید، خالد اور تمہاری بہن بیک وقت جہاز سے غائب ہوئے ہیں اور وہ یقیناً تمہاری قید میں ہیں۔ مجھے تم سے کسی نیکی کی توقع نہیں لیکن ہم اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ہمیں سندھ کے راجہ کے سامنے پیش کیا جائے اور جب تک وہ ہمارا فیصلہ نہیں کرتا، ناہید اور خالد کو ہمارے ساتھ رکھا جائے۔“

تمہیں بلا بھیجا اور تم نے ان سے قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت حاصل کر لی، تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں خواہ مخواہ کی ذمہ داری سے بچ جاؤں گا۔“

عمل سے نکل کر چند قدم کے فاصلے پر جے رام اور پرتاپ رائے قید خانے کی چاب دیواری میں داخل ہوئے۔ پہرہ داروں نے پرتاپ رائے کا اشارہ پا کر غروں کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ عورتوں نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے۔ عرب ملاحوں نے جے رام کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیے۔ زبیر ایک کونے میں دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے نفرت اور حقارت سے جے رام کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی طرح منہ پھیر لیا۔

جے رام نے پرتاپ رائے کی طرف دیکھا اور کہا: ”میری بہن یہاں نہیں، وہ کہاں ہے؟“

پرتاپ رائے نے ایک پہرہ دار کو آواز دے کر اندر بلایا اور اس سے پوچھا: ”کیا تمام عورتیں اسی کمرے میں ہیں یا سرانڈیپ کے ملاحوں کے کمرے میں بھی کوئی ہے؟“

”نہیں مہاراج! تمام عورتیں یہیں ہیں۔“

جے رام نے بدحواس سا ہو کر زبیر کی طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا: ”زبیر! میری طرف اس طرح نہ دیکھو! میں بے قصور ہوں۔ تمہیں معلوم ہے۔ میری بہن کہاں ہے؟“

زبیر کے منہ سے اچانک ایک بھوکے شیر کی گرج سے ملتی جلتی آواز نکلی۔ ”تم میری توقع سے کہیں زیادہ ذلیل ثابت ہوئے ہو۔ تم جھوٹ سے حقیقت پر پردے نہیں ڈال سکتے لیکن یاد رکھو، اگر ناہید کا بال بھی بیکا ہوا، تو خدا کی زمین پر تمہیں کوئی ایسا خطہ نہیں ملے گا جو ہمارے انتقام سے پناہ دے سکے۔ ناہید کو اڑانے کے لیے

پرتاپ رائے نے چونک کر کہا "میں اب سمجھا جے رام اگر ان لڑکیوں کے ساتھ جہاز پر سے کوئی آدمی بھی غائب ہوا ہے تو یہ معاملہ صاف ہے، کل رات بند گاہ سے ایک سرکاری کشتی بھی غائب ہو گئی ہے لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ تم میرے ساتھ آؤ!"

پرتاپ رائے اور جے رام قید خانے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور انھیں سرپٹ دوڑاتے ہوئے بندرگاہ پر پہنچے۔ بندرگاہ کے پیریداروں نے شام کے وقت کشتی غائب ہوجانے کے متعلق پرتاپ رائے کے بیان کی تصدیق کی، اور مایا کے متعلق جے رام کی تشویش بڑھنے لگی۔ پرتاپ رائے نے چند کشتیاں اور جہاز شمال اور مغرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کئے لیے روانہ کر دیئے اور جے رام کو تسلی دی کہ وہ زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ جے رام پرتاپ رائے کے ساتھ واپس شہر چلا آیا۔

سہ پہر تک اپنے مکان میں مایا کے متعلق کوئی خبر نہ پا کر اس نے بندرگاہ پر جانے کا ارادہ کیا لیکن پرتاپ رائے کا نپاہی آیا اور اسے اپنے ساتھ اس کے محل کی طرف لے گیا۔

(۲)

پرتاپ رائے کے محل کے پائیں باغ میں زبیر اور علی ناریل کے دو درختوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ پرتاپ رائے، اس کے چند سپاہی اور دو جلاوطنوں میں کوڑے لیے ان کے پاس کھڑے تھے۔ علی اور زبیر کی جھکی ہوئی گردنیں اور عربی سینوں پر ضربوں کے نشانات یہ ظاہر کر رہے تھے کہ انھیں ناقابل برداشت جسمانی اذیت پہنچائی جا چکی ہے۔ ایک سپاہی نے جے رام کی آمد کی اطلاع دی،

اور پرتاپ رائے کا اشارہ پاکر جلاوطن زبیر اور علی پر کوڑے برسانے لگے۔ زبیر ایک چٹان کی طرح کھڑا تھا لیکن علی کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور کوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

باہر کے دروازے میں پاؤں رکھتے ہی علی کی چیخ پکارنے جے رام کو متوجہ کیا اور اس نے بھاگ کر دونوں جلاوطنوں کو یکے بعد دیگرے پیچھے دھکیل دیا اور پرتاپ رائے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "یہ ظلم ہے۔ یہ پاپ ہے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ نے ان کا فیصلہ راجہ پر چھوڑ دیا ہے۔"

پرتاپ رائے نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ لڑکا نپاہیوں نے شہر سے تلاش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمھاری بہن کے ساتھ ہی جہاز پر سے اڑ پویش ہوا تھا، اور اس کے باقی ساتھی شہر کے آس پاس کہیں چھپے ہوئے ہیں۔"

جے رام نے آگے بڑھ کر علی سے پوچھا۔ "تم کہاں تھے؟ میری بہن کہاں ہے؟" علی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر گردن جھکالی۔ جے رام نے کہا۔ "اگر تمہیں مایا دیوی کے متعلق کچھ معلوم ہے تو بتا دو۔ میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔"

علی نے دوبارہ گردن اٹھائی اور چلا چلا کر کہنا شروع کیا۔ "میرے معلوم نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے ان کے متعلق معلوم نہیں۔ میں نے جہاز پر سے کودنے سے پہلے انھیں تلاش کیا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیسے غائب ہوئے۔" جے رام نے پوچھا۔ "تم شہر میں کیسے پہنچے؟"

میں جہاز سے کود کر سمندر کے کنارے ایک کشتی میں چھپ گیا تھا۔ آج میں شہر آ پہنچا اور سپاہی مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ تم سب ظالم ہو۔ میں نے تمھارا کوئی قصور

دے گئی۔

پرتاپ رائے نے ایک سپاہی کو گرم لوبہ لانے کا حکم دیا جسے رام پھر چلایا۔
پرتاپ تم ظالم ہو، کیٹے ہو۔ مجھے جو سزا چاہو دے لو لیکن ان پر رحم کرو۔
پرتاپ رائے نے گرج کر کہا۔ ”مجھے تمہاری بدزبانی کی پروا نہیں۔ میں تمہارا
فیصلہ مہاراج پر چھوڑوں گا لیکن اس وقت ان کی جان میرے قبضے میں ہے۔ میں
ان کی آنکھیں نکوا دوں گا۔ ان کی بوٹیاں نوچ ڈالوں گا۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ زندہ بھی
رہیں اور تم مہاراج کے پاس جا کر اپنی بہن کے اعوا کیے جانے کی ذمہ داری بھی مجھ
پر ڈالو۔ اگر تمہاری بہن جہاز پر سے ٹکب ہوئی ہے تو میں ضرور اس کا پتہ لگاؤں گا۔
اس کے لیے اگر مجھے ان تمام بچوں اور عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا پڑا تو بھی دریغ
نہیں کروں گا۔“

سپاہی نے لوہے کی سلاخ پرتاپ رائے کے ہاتھ میں دے دی اور وہ زبیر
کی طرف بڑھا۔ جسے رام نے بلند آواز میں کہا۔ ”نہیں نہیں!! ٹھہرو! میری بہن جہاز پر
رہتی۔ میں اکیلا آیا تھا۔ میں فقط ان کی جان بچانا چاہتا تھا۔“

پرتاپ رائے نے جواب دیا لیکن مجھے کیونکر یقین آئے کہ تم راجہ کے سامنے
ایسی کہانیاں بیان کر کے اسے میرے خلاف نہیں بھڑکاؤ گے۔“

”پرتاپ میں وعدہ کرتا ہوں ایک راجپوت کا وعدہ! مجھ پر اعتبار کرو۔“
”تمہیں یہ گواہی بھی دینی پڑے گی کہ جہاز پر سے کوئی بھی لڑکی غائب نہیں
ہوئی۔“

”اگر تم انہیں چھوڑ دو تو میں یہ وعدہ کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔“
”انہیں چھوڑنا نہ چھوڑنا راجہ کا کام ہے۔ میں صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ ان
کے ساتھ آئندہ کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ تمہیں راجہ کے سامنے یہ بھی ماننا پڑے گا۔“

نہیں کیا۔“

بے رحمی نے زبیر کی طرف دیکھا لیکن حیرانی، غصہ، ندامت اور افسوس کے
جذبات کے ہیمان میں وہ اس سے مخاطب ہونے کے لیے موزوں الفاظ تلاش
نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں ایک بار اٹھیں اور جھک گئیں۔ ہونٹ پکپکاتے اور ایک
دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ اس نے پرتاپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آپ انہیں
چھوڑ دیں۔ مجھے ان پر کوئی شبہ نہیں۔“

پرتاپ رائے نے کہا۔ ”میں انہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر تمہاری بہن جہاز
پر تھی تو ان کو یقیناً یہ علم ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ تم شاید اب تک مجھے مجرم خیال کرتے
ہو اور میں ان لوگوں کی زبان سے تمہیں یقین دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تمہاری بہن
کو ان لوگوں نے چھپا رکھا ہے اور اگر وہ زندہ نہیں تو انہوں نے جہاز پر حملہ ہونے
سے پہلے اسے سمندر میں پھینک دیا ہو گا۔ اب یا انہیں اپنے جرم کا اقبال کرنا
پڑے گا اور یا تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمہاری بہن جہاز پر تھی ہی نہیں اور تم نے
مجھے مرعوب کرنے کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا تھا۔“

پرتاپ رائے نے پھر جلاؤں کو اشارہ کیا اور وہ زبیر اور علی پر پھر کڑے برسائے
لگے، جسے رام چلایا۔ ”ٹھہرو! ٹھہرو!! یہ بے قصور ہیں۔ یہ ظلم ہے۔ انہیں چھوڑ دو۔“
لیکن اس کی چیخ پکار بے اثر ثابت ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جلاؤ کے منہ
پر گھونسا (سید کیا، لیکن پرتاپ رائے کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اسے پکڑ
کر پیچھے ہٹا دیا وہ سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ علی
چینیں مارنے کی بجائے نیم بیہوشی کی حالت میں آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ زبیر ہر کڑے
کی ضرب کے بعد جسے رام کی طرف دیکھتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ بالآخر علی کے کہنے
کی آواز بند ہو گئی اور گردن اٹھانے اور آنکھیں کھولنے کے لیے زبیر کی طاقت بھی جواب

احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔ دیل کے سردار نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ تمہارے جہازوں پر حملہ کرنے سے پہلے مجھے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ تم مجھ سے بظن ہو۔ مجھے دغا باز سمجھتے ہو لیکن میں بے قصور ہوں۔ اگر بھگوان نے موقع دیا تو میں یہ ثابت کر سکوں گا۔“

زبیر نے کہا۔ ”اگر تم اس سازش میں شریک نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ ناہید اور خالد کہاں ہیں؟“

جے رام نے جواب دیا۔ ”اگر تم مایا کے متعلق کچھ نہیں جانتے تو میں خالد اور ناہید کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ساری رات کوٹھری میں بند رہا۔ تم جہاز پر تھے۔ بندرگاہ سے ایک کشتی بھی اس رات غائب ہو چکی ہے۔ اگر تم نے لڑائی سے پہلے انہیں کہیں بھیج دیا ہے، تو بھگوان کے لیے مجھ سے نہ چھپاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے انہیں پرتاپ رائے کے ظالم ہاتھوں سے بچانے کی نیت سے کہیں بھیجا ہوگا مجھے صرف اتنا بتا دو کہ مایا زندہ ہے اور کسی محفوظ جگہ پر ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی آپریشن نہ آنے دوں گا۔ میں پرتاپ رائے کو لیتین دلا چکا ہوں کہ میری بہن میرے ساتھ نہ تھی۔ ورنہ آج تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”کاش! میں تم پر اعتبار کر سکتا۔ تم دونوں ناہید کو چھپا کر مایا کی ذمہ داری ہمارے سر اس لیے تھوپ رہے ہو کہ ہم راجہ سے ناہید اور خالد کے متعلق سوال نہ کر سکیں۔“

جے رام نے کہا۔ ”زبیر مجھ پر اعتبار کرو۔ مجھے تم سے جھوٹ بولنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو مایا اور ناہید کے متعلق کوئی علم نہیں تو یہ پرتاپ رائے کی شرارت ہے۔ آج وہ میرے سامنے تم دونوں کو اس لیے سزا دے رہا تھا کہ میں آئندہ مایا اور ناہید کا نام نہ لوں۔ میں یہ وعدہ کرتا ہوں اور تم نہیں جانتے

کہ تم نے ان لوگوں کو چھڑانے کی نیت سے مجھ پر دباؤ ڈالا اور اپنی بہن کو ایک بہانا بنایا تھا۔“

جے رام نے شکست خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

پرتاپ رائے نے لوہے کی سلاخ پھینکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔“

(۳)

زبیر نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں وہ علی کے قید خانے میں پڑا ہوا تھا۔ جے رام ٹھنڈے پانی کی بالٹی سے رومال بھگو بھگو کر اس کے زخموں پر ٹکڑ کر رہا تھا۔ ایک عورت علی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ زبیر ہوش میں آتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جے رام نے پانی کا کٹورا بھر کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ زبیر کے دل میں ایک لمحہ کے لیے پھر ایک بار غصہ اور حقارت کے جذبات بیدار ہوئے لیکن جے رام کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔ جے رام نے فقط اتنا کہا۔ ”زبیر! مجھے افسوس ہے۔“ اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ زبیر نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”جے رام! تم میرے لیے ایک معما ہو۔ تم نے دیل کے حاکم سے ساز باز کر کے ہمیں اس حالت تک پہنچایا۔ اس کے بعد تم میرے لیے جلاؤں سے نبرد آزما ہوئے۔ اب تم آنسو بھی بہا رہے ہو آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟“

جے رام کے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ ”زبیر! مجھ پر اعتبار کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم نے میری جان بچائی تھی اور ایک راجپوت

کہ ایک راجپوت بھائی کے لیے اپنی بہن کے متعلق اس قسم کا وعدہ کرنا کس قدر صبر آزما ہے۔“

زبیر نے جواب دیا: ”تمہاری مہربانی کا شکریہ۔ اس وقت ہم پر تمہاری تلواروں کا پہرہ ہے۔ ہمارے لیے تمہارے جھوٹ اور سچ سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں سچ بولنے کا انعام دے سکتا ہوں۔ نہ جھوٹ بولنے کی سزا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ ہم تمہاری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوئے اور جب تک میں ناہید کو نہیں دیکھتا، مجھے نہ تم پر اعتبار آ سکتا ہے اور نہ دیل کے حاکم پر۔ اگر مستقبل کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ تم اس معاملے میں بے قصور تھے تو میں تم سے اس بدگمانی کے لیے معذرت کروں گا۔ اگر دیل کا حاکم قصور والی ہے تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہماری آواز راجہ کے کانوں تک پہنچ جائے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو خالد، ناہید اور تمہاری بہن کے متعلق کوئی علم نہیں۔ دوسرے جہاز سے سرانڈیپ کے ملاحوں نے ہمارے جہاز کے چند آدمیوں کو ایک کشتی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ کشتی جنوب کی طرف غائب ہو گئی تھی۔ اگر انہیں اس کشتی پر اغوا کیا گیا ہے تو معاملہ صاف ہے۔ کشتی ہمارے جہازوں سے نہیں بلکہ بندرگاہ سے غائب ہوئی ہے اور اس بات کا علم بندرگاہ والوں کو ہونا چاہیے کہ وہاں سے کشتی کون لایا۔“

جے رام نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: ”پر تاپ! کمینہ! مکار! ظالم بزدل! — زبیر بھگوان کے لیے میری خطا معاف کر دو۔ میں نے تم پر شک کیا۔ میں نادم ہوں۔“

زبیر کو ان الفاظ سے زیادہ جے رام کی پریم آنکھوں نے متاثر کیا اور اس نے جے رام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”جے رام! تم جاؤ۔ انہیں تلاش کرو۔ پر تاپ رائے ظالم سمجھی ہے اور مکار بھی۔ اسے اپنے دل کا حال نہ بتانا۔ ورنہ

تم اپنی بہن کو تلاش نہ کر سکو گے اور نہ راجہ ہی کے کانوں تک یہ خبر پہنچ سکے گی۔“
جے رام اٹھ کر قید خانے کی کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ پہرہ داروں نے دروازہ بند کر دیا۔ چند قدم دور جانے کے بعد جے رام نے واپس آ کر ایک پہرہ دار کو سرانڈیپ کے ملاحوں کی کوٹھری کا دروازہ کھولنے کے لیے حکم دیا۔

ان لوگوں سے چند سوالات پوچھنے کے بعد جب وہ باہر نکلا تو اس کے دل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ سرانڈیپ کے ملاح زبیر کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کر چکے تھے اور اسے انہوں نے تھاکہ اسے زبیر کی باتوں پر شک کیوں گزرا۔

اور وہ خالد کے ساتھ کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جاتے جہاں صاف اور شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہوں۔ آبشاریں محبت کے گیت گاتی ہوں۔ سدا بہار درخت لہلہاتے ہوں۔ گہری جھیل میں کنول کھلتے ہوں۔ دیبل کی بندرگاہ کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے اس کے سپنوں کی رنگین دنیا درہم برہم ہوتی لیکن قدرت نے جب انہیں جہاز کی بجائے ایک کشتی پر سوار کر دیا تو مایا دیوی پھر سپنوں کی ایک نئی دنیا آباد کرنے لگی لیکن دیبل کے حادثہ نے ایک جیتے جاگتے نوجوان کو ایک پتھر کا ٹمہ بنا دیا تھا۔ محبت اور وفا کی دیوی کی ملتی اور متمنی نگاہوں کے جواب میں خالد کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان لوگوں میں صرف ناہید ایسی تھی جسے یہ یقین تھا کہ دیبل کے حادثے سے مایا دیوی کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک عورت کی ذکاوت جس سے مایا کی ذہنی کشمکش کا اندازہ کر چکی تھی، اسے جب بھی موقع ملتا، وہ خالد کے سامنے مایا کی پاکیزگی، اس کی معصومیت اور اس کی جیا کا ذکر چھیڑ دیتی۔ خالد گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا تو وہ کہتی ”خالد! تمہارا دل بہت صحت ہے۔ تم دیکھتے نہیں اس کا سرخ و سفید چہرہ دوپہر کے پھول کی طرح مرجھا گیا ہے۔ اس کا بھائی براہی لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ معصوم ہے۔ وہ تمہیں اپنی آخری پناہ خیال کرتی ہے۔ تم اسے تسلی دے سکتے ہو۔ وہ اب یہاں تک کہہ چکی ہے کہ اگر اس کا بھائی واقعی اس سازش میں شریک تھا تو وہ اس کے پاس جانے سے مرنا بہتر سمجھتی ہے۔“

اور وہ جواب دیتا ”میں دوپہر کے وقت چراغ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں جو کچھ دیکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد اس لڑکی کے متعلق اپنی رائے بدلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

(۲)

چند دن اس قلعے میں رہنے کے بعد ناہید چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی لیکن قمر کا زخم ابھی تک منڈل نہیں ہوا تھا۔ خالد کبھی کبھی سواروں کی کسی ٹولی کے ساتھ گشت کے لیے چلا جاتا۔

ایک شام مختلف اطراف سے سپاہیوں کی تمام ٹولیاں واپس آگئیں لیکن خالد اور اس کے چار ساتھی واپس نہ آئے۔ ناہید نماز مغرب کے بعد اپنے بھائی کی خیریت کے لیے دعا کر رہی تھی۔ گنگو اپنے چند ساتھیوں کو خالد کی تلاش میں روانہ کر کے ایک اونچے درخت پر چڑھ کر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مایا قلعے سے باہر نکل کر گھنے درختوں میں سے ادھر ادھر جھانک رہی تھی۔ اچانک اسے دور سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کا دامن ایک جھاڑی کے کانٹوں سے الجھ گیا۔ وہ کانٹوں کو انگ کر رہی تھی کہ جھاڑیوں کے عقب سے خالد اور دوسرے سوار نمودار ہوئے۔ خالد نے گھوڑا روکتے ہوئے پوچھا ”میری بہن کیسی ہے؟“

کانٹوں کے راستے یہ الفاظ مایا کے دل میں اتر گئے۔ وہ خالد کی طرف دیکھنے لگی۔ خاردار جھاڑی کی چند شاخیں جو اس نے بڑی مشکل سے اپنے دامن سے جدا کی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر اس کے دامن میں الجھ گئیں۔

خالد نے پھر کہا ”بتاؤ میری بہن ٹھیک ہے نا؟“

مایا نے چونک کر جواب دیا ”وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ نے بہت دیر لگائی“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں — کچھ نہیں“ یہ کہہ کر مایا پھر اپنے دامن کو کانٹوں سے چھڑانے لگی،

لیکن اس کی نگاہیں خالد پر گڑی ہوئی تھیں۔ خالد گھوڑے سے اترا اور اس کے ساتھی

”گھوڑوں کی ٹاپ سن کر اس طرف لوٹ آئی۔ آج آپ نے بہت دیر کی ہیں۔۔۔ بہت پریشان تھی۔“

میں تمہاری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر میں زہیر اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح قید میں ہوتا تو تمہیں بہت اطمینان ہوتا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اب بھی قید میں ہوں۔ میں تمہارے بھائی کی طرح اپنی بہن کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

مایا کے دل پر ایک چوکا لگا۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس نے خلاف معمول خالد کی طرف ٹکٹکی بانٹ کر دیکھا اور اس کی چمکتی ہوئی پتلیوں پر پھر ایک بار پانی کے دھندلے نقاب چھا گئے۔ یہ نقاب ابھر کر پھٹتے ہوئے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئے۔ بلکہ انہیں زیادہ سنہارا نہ دے سکیں۔ دوچمکتے ہوتے موتی رخساروں پر ہلکی ہلکی لکیریں چھوڑتے ہوئے ہونٹوں پر اڑ کے۔ مایا نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔

”چلو اب دیر ہو رہی ہے۔“ خالد کی آواز سن کر مایا نے چونک کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کا دامن کانٹوں سے الگ ہو چکا تھا اور خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ بولی :-

”آپ جانتے ہیں خود آج اداں گی لیکن میں آپ سے آخری بار صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ اگر میرا بھائی اس سازش میں شریک تھا تو بھی یہ انصاف نہیں کہ اس کے پاپ کی سزا مجھے ملے۔“

خالد نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں سزا نہیں دینا چاہتا۔ تمہیں بہت جلد تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ تمہارا بھائی بھی تم سے دور نہیں۔ وہ یہاں سے چار کوس دور دریا کے کنارے ایک ٹیلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ وہ راجہ سے انعام حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو برہمن آباد لے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ دس کا حکم

دزدیدہ لگا ہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے آگے نکل گئے خالد شاخوں کو ایک ایک کر کے اس کے دامن سے الگ کرنے لگا۔ مایا کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو اٹھنے لگے۔ اس نے اپنا کانٹا ہاتھ خالد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

خالد نے ایک شاخ اس کے دامن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”اے پکڑو۔“ اس نے جلدی سے شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن ایک تیز کاٹا اس کی انگلی میں پیوست ہو گیا اور شاخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر اس کے دامن میں الجھ گئی۔ مایا کانٹے کی تکلیف کے باوجود مسکرائی۔ تشکر کے آنسوؤں میں بھگی ہوئی مسکراہٹ نے اس کا چہرہ شبنم آلود پھول سے کہیں زیادہ دلفریب بنا دیا۔ خالد نے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”لاؤ میں نکال دوں۔“

مایا نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ خالد کاٹا نکال کر پھر چھڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں آئیں؟“

مایا نے جواب دیا۔ ”قلعے میں گرمی تھی اور میں ذرا ہوا خوری کے لیے نکل آئی تھی۔“ لیکن اس کا دل کھرا رہا تھا۔ ”کیا سچ تم میرے یہاں آنے کی وجہ نہیں سمجھ سکے؟ کاش میں تمام عمر کانٹوں میں الجھی رہوں اور تم نکالتے رہو۔“

خالد نے جواب دیا۔ ”لیکن اس وقت درختوں کے نیچے تو زیادہ جیس ہے؟“ مایا نے پریشان سی ہو کر خالد کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”میں دریا کی طرف جا رہی تھی۔“

”دریا دوسری طرف ہے۔“

”میں بھی اسی طرف جا رہی تھی لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

کی طرف مائل ہوئے اور وہ وحشی ہرنی کی طرح کتر کر بھاگی۔
 خالد نے جواب دیا۔ ”میرے دل میں شاعری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اب
 آپ بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آپ دیبل کے قافلے کی خبر سن چکے ہوں گے۔“
 ”ہاں میں سن چکا ہوں۔ ان کے ساتھ دو سو مسلح سپاہی ہیں ہم مٹھی بھر آدمیوں کے
 ساتھ ان پر حملہ نہیں کر سکتے۔ میں جے رام کو یہاں لانے کی تجویز سوچ چکا ہوں۔“
 ”دیکھا اس لڑکی کی باتوں میں اگرناہید جے رام کے متعلق اپنے خیالات بدل چکی
 تھی اور آپ بھی متاثر ہو رہے تھے۔“
 گنگو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”بیٹا! تم مجھ سے زیادہ متاثر تھے۔ بہر حال
 مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ مایا معصوم ہے۔“

”اور اس کے باوجود آپ جے رام کو مایا کے قتل کی دھمکی دینا چاہتے ہیں۔“
 ”تمہارے ساتھیوں کو آزاد کرانے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔“
 ”لیکن اگر جے رام نے اپنے راجہ کی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کر دیا تو؟“
 ”مجھے ایسی امید نہیں لیکن اگر جے رام اس قدر ذلیل ثابت ہوا تو مایا جیسی لڑکی کو
 ایسے ظالم بھائی کے ہاتھوں سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ وہ خود بھی جے رام کی بجائے
 تمہاری پناہ کو ترجیح دے گی۔ چند دنوں تک تمہاری بہن سفر کے قابل ہو جائے گی،
 اور ہم تمہیں مکران کی حدود کے اندر پہنچا دیں گے۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کو مصیبت میں چھوڑ کر چلے جائیں۔“
 ”تم وہاں جا کر ان کی زیادہ مدد کر سکو گے۔ عربوں کے علاوہ سرانڈیپ کے ملاحوں
 کو بھی قید میں رکھے جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تمہارے جہازوں کے لوٹے جانے
 کی خبر سندھ سے باہر نہ نکلے۔ اگر یہ خبر وہاں تک پہنچ گئی تو تمہاری قوم اسے خاموشی
 سے برداشت نہیں کرے گی لیکن تم اس وقت تک نہیں جا سکتے۔ جب تک

بھی ہے۔ کل تک وہ برہمن آباد پہنچ جائیں گے۔ شاید آج رات ہی تمہارے بھائی کے
 پاس ہمارا پیغام پہنچ جاتے اور اگر اس نے قیدیوں کو چھوڑنا منظور کر لیا، تو تمہیں اس
 کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ میں شروع سے اس بات کا حامی نہ تھا کہ تمہیں یہاں رکھا
 جائے۔ ہمارا اخلاق ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک بے بس عورت پر ہاتھ بٹھائیں
 تم اطمینان رکھو۔“

”آپ کو کس نے بتایا کہ میرا بھائی قیدیوں کو لے جا رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ
 پرتاپ کے ساتھ وہ بھی ایک قیدی کی حیثیت میں جا رہا ہو۔“
 ”میں آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک مشکلی گھوڑے پر سوار تھا،
 اور قیدی بیل گاڑیوں پر بھی پابہ زنجیر تھے۔ چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ گنگو میرا انتظار
 کر رہا ہوگا۔“

”آپ جائیں! میں ابھی آتی ہوں۔“

(۳)

خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلتا ہوا قلعے کے دروازے تک پہنچا۔ گنگو باہر
 اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”خالد! مایا کو کہاں چھوڑ آئے؟“

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”وہ آ رہی ہے۔“

”رات ہو رہی ہے۔ تم اسے ساتھ کیوں نہ لے آئے؟“

”آپ لے آئیں، وہ کہتی تھی تم جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

گنگو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ عورت بھی عجیب مخلوق ہے۔ وہ چھپ چھپ
 کر تمہاری راہ دیکھ سکتی ہے۔ تمہارے لیے کانٹوں میں الجھ سکتی ہے لیکن تم ذرا اس

کہ ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ اگر بے رام ہمارے قابو میں آگیا تو یہ ممکن ہے کہ ہم کم از کم زبیر کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”اگر یہ ہو سکے، تو بہت اچھا ہوگا۔ میں عرب میں کسی کو نہیں جانتا ممکن ہے کہ لہرہ اور دمشق میں میری آواز پر کوئی توجہ نہ دے لیکن زبیر وہاں ہزاروں آدمیوں کو جانتا ہے۔ ہاں! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آج رات میرے ذمہ کیا کام ہے؟“

گنگو نے جواب دیا۔ ”تم آرام کرو، لیکن مایا دیوی ابھی تک نہیں آئی۔ شاید وہ دوسرے راستے قلعے میں پہنچ گئی ہو۔“

”میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر خالد بھاگتا ہوا قلعے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے واپس آکر گنگو کو اطلاع دی کہ وہ اندر نہیں پہنچی۔“

گنگو نے کہا۔ ”تم اسے کتنی دور چھوڑ آئے تھے؟“

”ان جھاڑیوں کے پیچھے کوئی سودم کے فاصلے پر۔“

”تم نے اس کے ساتھ کوئی سخت کلامی تو نہیں کی؟“

نہیں لیکن اسے میری ہر بات پر آنسو بہانے کی عادت ہو چکی ہے۔ ہاں میں

ایک غلطی کر چکا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا بھائی یہاں سے چار کوس پر ہے۔“

”رات کے وقت اس جنگل کو عبور کرنا ایک عورت کا کام نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے

گنگو نے اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا اور جنگل میں مایا کو تلاش کرنے کا حکم دے

کر خالد سے کہا۔ ”میرے خیال میں وہ ابھی تک اس خاردار جھاڑی سے باتیں کر رہی

گی۔ تم اس طرف جاؤ۔ میں دریا کی طرف جاتا ہوں۔ مجھے اس پر شک

نہیں لیکن مایوسی کی حالت میں عورت توقع کے خلاف بھی بہت کچھ کر گزرتی

ہے۔ میں جاتا ہوں۔ کہیں دریا کے کنارے ہماری کشتی اس کی تباہی کا باعث نہ ہو۔“

(۴)

خالد کے جانے کے بعد مایا کچھ دیر اس خاردار جھاڑی کے قریب کھڑی رہی وہ کانٹے جو اس کے دامن کھینچ کر خالد کے ہاتھوں تک لے گئے تھے۔ اس کے لیے ہنکتے پھولوں سے کم نہ تھے۔ وہ ان چند لمحات کا تصور کر رہی تھی، جب خالد اس سے اس قدر قریب تھا۔ اس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے زہر اور شہد کے گھونٹ اپنے حلق سے اتار رہی تھی۔ اس کا دل خالد کے متعلق متضاد خیالات کی رزم گاہ تھا۔ وہ کبھی اسے قہر و غضب کا پیکر مجسم اور کبھی اسیارہ محبت کا دیوتا خیال کرتی۔ تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہنے کے بعد وہ اپنے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرنے لگی اور چاند کی روشنی میں درختوں اور جھاڑیوں سے بچتی ہوئی دریا کی طرف چل دی۔

دریا کے کنارے ایک کشتی کھڑی تھی۔ وہ کشتی جس نے انھیں سمندر سے یہاں

تک پہنچایا تھا۔ جس پر سفر کرتے ہوئے اس نے پہرہ دار آسمان کے ستاروں سے

باتیں کی تھیں اس نے کشتی کے ایک سرے پر بیٹھ کر نیچے پاؤں لٹکا دیے۔ پانی کی

لہریں اس کے پاؤں کو چھو رہی تھیں۔ اس پاس جنگل میں گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں

آ رہی تھیں۔ مایا نے اپنے دل سے سوال کیا۔ ”اگر کوئی بھیڑیا اس طرف آجائے تو؟“

اور پھر خود ہی جواب دیا۔ ”اگر بھیڑیا آجائے تو میں بھاگنے کی کوشش نہ کر دوں گی میں

کشتی سے اتر کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں گی اور پھر جب وہ صبح کے وقت میری

لاش دیکھے گا تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ وہ کہے گا، مایا! تم ادھر کیوں آئیں گی تو مجھے

وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

”تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا؟“

مایا خاموش رہی۔ گنگو نے پھر پوچھا۔ ”اس وقت ایسی سنان جگہ پر تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ سنو، چاروں طرف سے بھیڑیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ چلو میرے ساتھ!“

مایا نے کہا۔ ”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں“

”وہ کیا؟“

”آپ سچ مح مجھے میرے بھائی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟“
گنگو نے جواب دیا۔ ”میں اپنا فیصلہ بتانے سے پہلے تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔“

”بھگوان کے لیے مجھے اس کے پاس نہ بھیجتے!“

”لیکن کیوں؟“

”میں بھائی کے پاس نہیں جانا چاہتی۔ جس نے میری ماں کے دودھ کی لاج نہیں رکھی۔“

”یہ تم دل سے کہہ رہی ہو یا مجھے بنانے کے لیے؟“

”کاش آپ میرا دل چیر کر دیکھ سکتے۔“

”لیکن جے رام سے نفرت کی وجہ؟“

”میں خالد سے اس کے متعلق سن چکی ہوں اور اب مجھے اس کی دغا بازی کے

متعلق کوئی شبہ نہیں رہا۔“

”لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تمہیں تمہارے بھائی کے حوالے کر کے ذمیر کے ساتھ

ساتھ مذاق کرتا تھا میں جانتا تھا، تم بے قصور ہو۔ مایا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی۔ نہیں نہیں!! وہ شاید یہ نہ کہے۔ وہ کہے گا۔ یہ دیوانی تھی یہ لگی تھی۔ ہاں میں سچ مح لگی ہوں۔ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ میرا دامن کانٹوں سے چھڑا رہا تھا اور میں سمجھ رہی تھی کہ مجھے دنیا کی بادشاہت مل گئی۔ میں دریا کے کنارے ریت کے گھر وندے بنا رہی تھی اس کا دل پتھر کا ہے۔ وہ ظالم ہے۔ اسے کسی پر اعتبار نہیں، اور ہر بھی کیونکر، میرے بھائی نے ان لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ کاش وہ میرا بھائی نہ ہوتا۔ کاش اس نے جہاز پر مجھے بتا دیا ہوتا کہ وہ ان کے ساتھ یہ دھوکا کرنے والا ہے اور وہ چھپ چھپ کر خالد کو دکھتی۔ اب وہ مجھے بھائی کے پاس بھیجنے والے ہیں لیکن اگر اس کا انجام یہی تھا تو قدرت نے مجھے اس کے جہاز پر کیوں پہنچایا؟ اور پھر جب ہم دہلی سے جدا ہونے والے تھے، قدرت ہمیں یہاں کیوں لے آئی؟ میں اب تک اس کی نفرت کے باوجود اسے محبت کی نگاہوں سے کیوں دیکھتی رہی۔ میں نے مایوسی کی آندھیوں میں کھڑی ہو کر امید کے چراغ کیوں جلائے۔ ہاں میں مجسبو تھی۔۔۔۔۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔۔۔۔۔ میں اب بھی بے بس ہوں۔۔۔۔۔ میرا کوئی نہیں۔۔۔۔۔ میرا کوئی نہیں۔۔۔۔۔ میں اپنے بھگوان کو لپکار چکی ہوں، جس کی وہ دن میں پانچ بار عبادت کرتا ہے لیکن میرے لیے آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں۔ آنسو اور آہیں۔ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ کاش! سمندر کی لہریں مجھ پر ترس نہ کھاتیں۔“

مایا سر کو ہاتھوں کو سہارا دے کر دیر تک ہچکیاں لیتی رہی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ”مایا“ کہہ کر لپکارا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ گنگو اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بیٹی! تم ڈر گئیں، اس

مایا نے قدرے پر امید ہو کر جواب دیا: ”میں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دوں گی۔“

”وہ کیوں؟“

”میں ناہید کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔“

”مایا! میں ایک سوال پوچھتا ہوں، سچ کہو، تمہیں خالد کے ساتھ محبت ہے؟“

مایا نے آنکھیں جھکا لیں۔

اس نے پھر کہا: ”مایا! میرے سوال کا جواب دو۔“

وہ بولی: ”لیکن آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟“

”اس لیے کہ شاید اس سوال کا جواب پوچھ کر میں تمہارے لیے کوئی بہتر فیصلہ

کر سکوں۔“

”مجھے معلوم نہیں، لیکن میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں ان کے بغیر زندہ نہیں

رہ سکتی۔“

”تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارے متعلق اس کے شکوک ابھی تک رفع نہیں ہوئے

اس کا دل سمندر کی چٹانوں سے زیادہ سخت ہے۔ میں تمہیں بٹی کہہ چکا ہوں۔ آج

سے تمہارا سکھ میرا سکھ اور تمہارا دکھ میرا دکھ ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم کسی دن آ

اپنا بنا لینے کی امید پر سب کچھ قربان کر دو۔ ممکن ہے اسے تمام عمر تمہاری نیک نیتی

کا یقین نہ آئے۔ اپنے متعلق اس کے خیالات بدلنے کے لیے تمہیں بہت بڑی قربانی

دینی پڑے گی۔“

”میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں لیکن مجھ سے ہمیشہ کی جدائی برداشت نہیں

ہو سکتی۔“

”تمہیں بھائی کا خیال تو نہیں تسکے گا۔“

کو آزاد کر داسکیں۔“

”اگر جے رام ایک دفعہ دھوکا کر چکا ہے تو وہ دوبارہ موقع ملنے پر بھی ایسا ہی کرے

گا۔ اسے کسی صورت بھی یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ ورنہ وہ

راجہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگل کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ ناہید اچھی طرح چلنے

پھرنے کے قابل نہیں ہوئی۔ آپ کے لیے اس کی حفاظت بہت مشکل ہو جائے

گی۔“

بیٹی بتم اطمینان رکھو۔ جے رام کو تمہیں میرے قبضہ میں دیکھ کر سب مکاریاں

بھول جائیں گی۔ اگر بعد میں اس کی طرف سے کوئی خدشہ بھی پیش آیا۔ تو ناہید کے لیے

میں ایک اور محفوظ جگہ تلاش کر چکا ہوں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے قیدی آپ کے حوالے کر دیے تو آپ

مجھے اس کے سپرد کر دیں گے؟“

”بیٹی! وہ تمہارا بھائی ہے تم اس کے پاس جانے سے کیوں ڈرتی ہو؟“

”میرا دنیا میں کوئی نہیں، بھائی نے مجھے اپنے مقصد پر قربان کرنا چاہا اور میں

آپ کے قبضے میں آگئی۔ اب آپ مجھے بیٹی کہہ کر اپنے مقصد کے لیے پھر اس کے

پاس بھیجنا چاہتے ہیں، اپنے بھائی کی طرح آپ کا فیصلہ بھی میرے لیے تقدیر کا حکم ہو

گا۔ کاش! میری تقدیر میرے ہاتھ میں ہوتی۔ کاش! مجھے اس دنیا میں اپنا راستہ تلاش

کرنے کا حق ہوتا لیکن میری پسند اور ناپسند کے کوئی معنی نہیں میں اس طوفان میں

ایک تنہا ہوں جسے ہوا کا جھونکا جس طرف چاہے اڑا کے لے جاسکتا ہے۔ میرا ہونا

نہ ہونا برابر ہے۔“

لنگو نے کچھ سوچنے کے بعد کہا: ”اگر یہ معاملہ تمہاری پسند پر چھوڑ دیا جائے تو تم

کیا کر دو گی؟“

”راجہ کے ٹکڑے کھانے کے بعد وہ میرا بھائی نہیں رہا۔ مجھے اس سے کوئی
بہتر دی نہیں۔“

گنگو نے کہا: ”میں اسے ایک طریقے سے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ اس کی
صورت دیکھ کر تمہارا دل پسینہ تو نہ جائے گا۔“ اس نے اپنے عمنوں سے دعا
کی ہے۔ اگر اس کی سزا تم پر چھوڑ دی جاتے، تو تم اس کے ساتھ کیا سلوک کر دگی؟
”وہی جو ایک دعا باز، فربہ اور بزدل کے ساتھ ہونا چاہیے۔“

گنگو نے کہا: ”مایا! مجھے سوچ کر جواب دو۔ یہ ایک کڑا امتحان ہے۔ ممکن
ہے کہ میں تمہارے بھائی کو تمہارے سامنے کھڑا کر کے تمہارے ہاتھ میں انصاف
کی تلوار دے دوں۔“

”میں سوچ چکی ہوں۔ میں اسے رحم کا مستحق نہیں سمجھتی۔“

گنگو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھاڑیوں کے پیچھے سے خالد کی آواز آئی: ”مایا! مایا! تم
کہاں ہو؟“

گنگو نے مایا سے کہا: ”تم کشتی میں چھپ جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں، باہر
نہ آنا۔“

مایا نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ گنگو کشتی سے اتر کر دریا کے
کنارے کھڑا ہو گیا۔ خالد نے پھر آواز دی، اور اس نے کہا: ”خالد میں ادھر ہوں؟“

(۵)

خالد نے جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہو کر پوچھا: ”مایا نہیں ملی؟ آپ یہاں
کیا کر رہے ہیں؟“

گنگو نے اپنے بچے کو مغوم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”مایا چلی گئی۔“

”اے بے چاری!“

خالد نے بدحواس ہو کر پوچھا: ”کہاں چلی گئی۔ کیا ہوا؟“
”خالد تم نے بہت بُرا کیا۔ کاش تم اس کا دل نہ توڑتے۔“
”آخر کیا ہوا؟ خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔“

”اب پچھتانے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ کاش وہ تم جیسے سنگدل انسان

سے محبت نہ کرتی!“

خالد نے بے تاب ہو کر گنگو کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ”خدا کے
لیے مجھے پریشان نہ کرو۔ صاف صاف کہو کیا ہوا؟“

”مایا چل بسی۔ میں یہاں پہنچا، تو وہ دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ میں نے اسے آواز
دی اور اس نے مجھے جواب دینے کی بجائے دریا میں پھلانگ لگا دی میں نے جلدی
جلدی کپڑے اتارے لیکن اتنی دیر میں اسے پانی کی لہر کنارے سے بہت دور لے
گئی۔ جب میں پانی میں کودنے لگا وہ لہروں کی آغوش میں چھپ چکی تھی۔“

خالد نے چلا کر کہا: ”مایا ڈوب رہی تھی اور تم اطمینان سے کنارے کھڑے کپڑے
اتار رہے تھے، بے رحم! ظالم! ڈاکو!!! میں سمجھتا تھا کہ تم انسان بن چکے ہو۔“

گنگو نے کہا: ”میں کپڑوں سمیت پھلانگ لگا دیتا تو خود ڈوب جاتا۔“

”تو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ڈوبنے سے دنیا میں کوئی کمی آجاتی؟“

”تو اس کے مرنے سے دنیا میں کون سی کمی آگئی ہے۔ بھائی سے اس کا دل ٹوٹ
چکا تھا تمہارے طرز عمل سے وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اچھا ہوا۔ وہ گھل گھل کر مرنے کی بجائے
دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ ہاں جب میں کپڑے اتار رہا تھا اور لہریں اسے دھکیل کر منہ صاف
کی طرف لے جا رہی تھیں۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ گنگو! مجھے بچانے کی کوشش بے نو
ہے۔ خالد کو میرا سلام کہنا۔ میں اس کی محبت سے مایوس ہو کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔“

خالد دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ گنگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”خالد چلو! اب انوس سے کیا حاصل؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔“
خالد نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم جاؤ!“
گنگو نے کہا۔ ”آج رات ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں چلو!“
خالد نے سخت لمحے میں کہا۔ ”گنگو خدا کے لیے جاؤ! مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔“

وہ بولا۔ ”خالد! مجھے معلوم نہ تھا کہ بایا کی موت کا تمہیں اس قدر صدمہ ہو گا۔ وہ میری اپنی جان پر کھیل کر بھی اسے جانے کی کوشش کرتا۔“
خالد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اس کی موت کا صدمہ! گنگو تمہارے پہلو میں ایک انسان کا دل نہیں۔ یہ حادثہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اس کی موت کا باعث میں ہوں اور میں مرتے دم تک اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا۔“
”لیکن تم تو مجھ سے کہی بار یہ کہ چکے تھے کہ مایا دیوی کو اس کے بھائی کے پاس بھیج دو اگر تمہیں اس سے جدا ہونے کا انوس نہ تھا تو اس کی موت کا اس قدر رنج کیوں ہے؟“
”گنگو خدا کے لیے میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سزا میری قوت برداشت سے زیادہ ہے۔“

”خالد چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایک بار پھر زندہ ہو جائے تو بھی تمہارا غم دور تمہیں اس کی محبت کا جواب دینے کی اجازت نہیں دے گا۔ تم اس کے ساتھ اسی طرح پیش آؤ گے۔ چلو ایک دو دن میں تم اسے بھول جاؤ گے۔“
خالد کوئی جواب دینے بغیر ایک گھرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا، اور دریا کی لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے دیر بھری آواز میں کہا۔ ”مایا! مایا! یہ تم نے کیا کیا!“

گنگو نے پھر کہا۔ ”خالد! تمہیں اب ایک مرد کے حوصلے سے کام لینا چاہیے۔“
”گنگو! تم جاؤ، میں ابھی آ جاؤں گا۔“
”اچھا تمہاری مرضی۔“ گنگو یہ کہہ کر چل دیا لیکن قلعے کا رخ کرنے کی بجائے جھاڑوں میں چھپتا ہوا کشتی کے قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ”مایا! اب نکل آؤ۔“

مایا کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ خالد اور گنگو کی باتیں سن چکی تھی۔ وہ اس موت کو جو اسے خالد کے دل سے اس قدر قریب لاسکتی تھی ہزار زندگیوں پر ترجیح دینے کے لیے تیار تھی۔ وہ خالد کی آہیں سن رہی تھی اور اسے خدشہ تھا کہ اس مذاق کے بعد خالد اس سے ہمیشہ کے لیے بظن ہو جائے گا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ کاش میں سچ مخ دریا میں کود گئی ہوتی، اور ان کی آن میں یہ خیال ایک خوفناک ارادے میں تبدیل ہو گیا۔
گنگو نے پھر آہستہ سے آواز دی۔ مایا کے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس نے اچانک اٹھ کر پانی میں چھلانگ لگادی۔

گنگو ”مایا! مایا!“ کہتا ہوا بھاگا۔ خالد بدحواس ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں بیک وقت دریا میں کود پڑے۔ گنگو کہہ رہا تھا۔ ”خالد! پکڑو یہ مایا ہے مایا ٹھہرو! آگے پانی بہت خطرناک ہے۔“ لیکن وہ تیر کر تیز دھارے میں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔
خالد تیزی سے پانی کو چیرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ مایا نے غوطہ لگا دیا لیکن اچھی خاصی تیراک کے لیے اپنے آپ کو پانی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ممکن نہ تھا۔ اس نے جلد ہی اپنا سر پانی سے باہر نکال لیا۔ اور پھر منہ بھار کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن خالد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اتنی دیر میں گنگو بھی پہنچ گیا اور دونوں مایا کو بہاؤ دے کر کنارے کی طرف تیرنے لگے۔

کنارے پر پہنچ کر گنگو نے کہا۔ ”خالد! اب مجھے اس لڑکی پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔“

بہن اور بھائی

علی الصباح قلعہ سے چار کوس کے فاصلے پر دریا کے کنارے پر تپ رلے
 کے سپاہی سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ جے رام دریا میں نہا کر کپڑے بدل رہا تھا کہ
 پاس ہی ایک جھاڑی کے عقب سے ایک سنسنا ہوا تیر آیا، اور اس کے پاؤں کے
 نزدیک زمین میں پیوست ہو گیا۔ تیر کے ساتھ ایک سفید رومال بندھا ہوا تھا جسے رام
 نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد زمین سے تیر نکالا اور اس کے ساتھ بندھا ہوا رومال
 کھول کر دیکھنے لگا۔ جس پر کونلے کے ساتھ یہ چند حروف لکھے ہوئے تھے:
 ”جے رام! میں تمہیں کس نام سے پکاروں۔ تم کو بھائی کہتے
 ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اگر میری جان بچانا چاہتے ہو، تو گنگو
 کے ساتھ چلے آؤ، ورنہ میری خیر نہیں۔“

تمہاری بد نصیب بہن

مایا

جے رام نے جھگٹے ہوئے جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر آواز دی۔ ”گنگو!
 گنگو! تم کہاں ہو؟“

اسے تمہاری بے رخی نے پاگل بنا دیا ہے۔“ اور پھر مایا سے مخاطب ہو کر پوچھا: ”مایا!
 تم نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی؟“

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ نے ان کے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا تھا؟
 گنگو نے خالد سے کہا۔ ”بھئی مجھے معاف کرنا۔ میں نے تمہیں چھپڑنے کے لئے
 مایا کو کشتی میں چھپا دیا تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ سچ ایسا کر دکھائے گی۔ تم دونوں
 ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور میں خوش ہوں۔“

خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں صرف آنسو تھے۔ محبت خوشی اور
 تشکر کے آنسو!

گنگو نے پوچھا۔ ”اب مایا کے متعلق تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مایا کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا کسی کو حق نہیں وہ اپنے
 متعلق خود فیصلہ کر سکتی ہے۔“

گنگو نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں یہاں ہوں اس طرف“
جے رام جھاڑیوں میں سے گزر کر اس کے قریب پہنچا۔ گنگو گھوڑے پر سوار تھا۔
جے رام نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بیقرار سا ہو کر پوچھا ”گنگو! مایا کہاں ہے؟ وہ کس
حال میں ہے۔ وہ تمہارے پاس کیسے پہنچی؟“
گنگو نے جواب دیا۔ ”مایا زندہ ہے اور میں تمہیں اس کے پاس لے جا سکتا
ہوں کو تم میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو؟“

”میں؟ مایا کے لیے سات سمندر عبور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بھگوان کے لیے
بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

”وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ تم میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔“

”اگر زیادہ دور ہو تو میں اپنا گھوڑا لے آؤں۔“

”تم اپنا گھوڑا لاسکتے ہو لیکن اگر تم نے پھر کوئی چالاکی کی تو یاد رکھو۔ مایا کو کبھی نہیں
دیکھ سکو گے۔ میں یہاں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔“

”میں ابھی آتا ہوں“ جے رام یہ کہہ کر ٹیلے کی طرف بھاگا۔ گنگو احتیاط کے طور
پر اس جگہ سے ہٹ کر گئے درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جے رام نے
جھاڑی کے قریب پہنچ کر گھوڑا رکھا اور گنگو کو وہاں نہ پا کر آواز دی۔ گنگو نے مطمئن ہو کر
اسے اپنے پاس بلا لیا۔

گنگو کے ساتھ چلنے سے پہلے جے رام نے اس سے کئی سوالات پوچھے، لیکن
گنگو نے صرف یہ جواب دیا کہ مایا کے پاس پہنچ کر تمہیں سب حال معلوم ہو جائے گا۔ جنگل
میں تھوڑی دور چلنے کے بعد گنگو کے دس اور مسلح ساتھی جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر ان کے
ساتھ شامل ہو گئے۔ جے رام کو گنگو کی نیت پر شبہ ہوا اور اس نے لگام کھینچ کر گھوڑے
کو روکتے ہوئے پوچھا ”گنگو! یہ کیا؟“ لیکن اس سے پہلے کہ گنگو کوئی جواب دیتا اس کے

سکتا۔“
گنگو نے جواب دیا۔ ”تم بھاگنے کی کوشش بھی کر دو تو کامیاب نہیں ہو سکتے اس
جنگل میں جگہ جگہ تیرا ناز چھپے ہوئے ہیں۔“
”لیکن گنگو میں نے تم سے کوئی وعدہ خلائی نہیں کی۔ تم جہاں کہو میں چلنے
کے لیے تیار ہوں۔“

”جو شخص زہر جیسے مہن کے ساتھ دغا کر سکتا ہے۔ مجھے اس کی کسی بات پر اعتبار
نہیں آ سکتا۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلتے رہو۔“

قلعہ چار کوس سے زیادہ دور تھا لیکن گنگو نے مصلحتاً طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار
کیا۔ قلعے کے سامنے پہنچ کر سوار گھوڑوں سے اترے۔ جے رام کو خالد قلعے سے باہر آنا
ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ ”خالد! خالد! تم بھی یہاں ہو۔“
تم بھی یہاں ہو۔ تمہاری بہن کہاں ہے؟“

خالد نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے کتر کر گنگو
کے پاس آکھڑا ہوا۔ جے رام کے دل پر چرکا لگا۔ اس کے پاؤں زمین میں گر گئے۔ وہ
ہاتھ جو خالد کے استقبال کے لیے اٹھے تھے، جھکتے جھکتے پہلوؤں سے آگے۔ اس

خالد کے ہاتھ کی ضرب منہ سے زیادہ دل پر محسوس کی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”خالد! تم —؟“

گنگو کے ساتھیوں کی تلواریں نیاموں سے باہر اچکی تھیں۔ لیکن اس نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور جے رام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب بتاؤ تم اپنی بہن کی جان بچانے کے لیے زہیر کے ساتھیوں کو قید سے چھڑانے کے لیے تیار ہو؟“

جے رام نے زخم خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ ”تو کیا تم بھی زہیر کی طرح یہ سمجھتے ہو کہ میں پرتاپ رائے کی سازش میں شریک تھا؟“

گنگو نے جواب دیا۔ ”نہیں بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پرتاپ رائے تمہاری سازش میں شریک تھا۔ تم نے اسے سرانڈیپ کے ہاتھیوں اور جواہرات کالا لچ دے کر جہاز لٹنے کے لیے آمادہ کیا۔“

”بھگوان جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”بھگوان اس سے زیادہ جانتا ہے۔ اس وقت تمہارا کام تمہاری بے گناہی پر بحث کرنا نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم اپنی بہن کے لیے ان بے گناہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“

جے رام نے جواب دیا۔ ”کاش! انہیں چھوڑنا میرے بس میں ہوتا۔ وہ اس وقت دو سوپا ہیوں کے پہرے میں برہمن آباد جا رہے ہیں اور میں اکیلا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”تو تم ہمیں یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمہارے اپنے سپاہی تمہارا کہا نہیں مانتے؟“

”کاش! وہ میرے سپاہی ہوتے۔ قیدیوں پر پرتاپ رائے کا پہرہ اس قدر سنگین

نے بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں چاروں طرف دیکھا اس کی نگاہیں پھر ایک بار خالد کے چہرے پر جم گئیں۔ خالد نے منہ پھیر لیا۔
 جے رام نے انتہائی کرب کی حالت میں کہا۔ ”خالد! مجھے معلوم نہیں۔ میں تم سب کی نظروں میں اس قدر حقیر کیوں ہو گیا ہوں۔“ میں بے قصور ہوں۔ میرے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ۔ مایا کہاں ہے؟“

(۲)

پیچھے سے آواز آئی۔ ”میں یہاں ہوں۔“ جے رام نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ مایا چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ ”مایا! مایا! میری بہن! میری ننھی بہن!! وہ یہ کہہ کر مایا کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے ہٹتے ہوئے چلائی۔ ”ظالم! کیسے، دعا باز! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم نے ایک راجپوت باپ کے خون اور ایک راجپوت ماں کے دودھ کی لاج نہیں رکھی تم میرے کچھ نہیں لگتے۔ تمہارا دامن اپنے محسنوں کے خون سے داغدار ہے۔“

اگر کوئی جے رام کا سینہ خنجر سے چھلنی کر ڈالتا، تو بھی شاید اس قدر تکلیف نہ ہوتی اس کے دل میں غصے کی آگ کے شعلے بھڑکے اور غم کے آنسوؤں سے بچھ گئے اس نے پھر ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ گنگو کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تقسم دیکھ کر اس کا منہ خون کھولنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ”ذلیل ڈاکو! ان سب باتوں کے ذمہ دار تم ہو۔ تم نے ان سب کو میرے خلاف کیا ہے۔“ پیشتر اس کے کہ گنگو کے ہاتھ مدافعت کے لیے اٹھتے، جے رام نے اچانک دو ٹوکے اس کے منہ پر دے مارے۔ گنگو اپنے گال سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ خالد نے آگے بڑھتے ہوئے ایک مکا جے رام کے منہ پر مارا۔ جے رام نے

ہتے کہ میں ان کے ساتھ بات چیت بھی نہیں کر سکتا۔ اسے یقین ہو چکا ہے کہ میں ان کا طرفدار ہوں۔“

گنگو نے اپنے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری طرفدار کا شکریہ! اب میرے سوال کا جواب دو۔ تم انہیں چھڑانے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“

بھگوان کے لیے مجھ پر اعتبار کر دو۔ جب تک ان کا معاملہ راجہ کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا۔ میں نے بس ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ راجہ انہیں قید میں رکھ کر عربوں سے لڑائی مول لینے کی جرات نہیں کرے گا۔“

گنگو نے کہا۔ ”پر تاپ رائے تمہارا دوست ہے اگر اس کے پاس تمہارا خط پہنچ جائے کہ تم ہماری قید میں ہو تو کیا پھر بھی وہ انہیں رہا نہیں کرے گا۔ تم یہ خط لکھ دو اور ہم اسے برہمن آباد پہنچنے سے پہلے تمہارا یہ خط پہنچا دیں گے۔“

جے رام نے جواب دیا۔ ”وہ دوسری سے زیادہ مکار اور بھڑیے سے زیادہ ظالم ہے۔ مجھے اپنی سرگزشت بیان کرنے کا موقع دو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ بھگوان کے لیے میری بات مانو۔ پر تاپ رائے کو میری جان بچانے سے زیادہ خالد اور اگرناہید بھی یہاں ہے تو ان دونوں کی تلاش ہوگی۔ جس طرح مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم یہاں کیسے پہنچے، اسی طرح تم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ وہیل کا واقعہ کس طرح پیش آیا۔“

گنگو اور اس کے ساتھیوں کو متوجہ دیکھ کر جے رام نے بندرگاہ سے رخصت ہونے سے لے کر قید خانے میں زبیر سے ملاقات تک کے تمام واقعات بیان کیے اور اختتام پر گنگو اور خالد کی طرف ملتی لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب بھی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا، تو میں ہر سزا خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

گنگو بولا۔ ”تو اب تم راجہ کے پاس قیدیوں کی سفارش کے لیے جا رہے ہو؟“

”آپ کو اب بھی یقین نہیں آیا؟“

”اپنی بہن سے پوچھ لو۔ اگر اسے تمہاری باتوں پر اعتبار آ گیا ہو تو ہم بھی تم پر اعتبار کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ یہ کہہ کر گنگو مایا سے مخاطب ہوا۔ ”ہم تمہارے بھائی کا فیصلہ تم پر چھوڑتے ہیں۔“

جے رام، مایا کی طرف متوجہ ہوا۔ مایا کے لیے یہ گھڑی صبر آزمائی تھی۔ بھائی کی سرگزشت سننے کے بعد اس کے دل میں ایک رد عمل شروع ہو چکا تھا تاہم وہ اس کے متعلق اپنے خیالات فوراً بدلنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ضمیر کی ایک آواز اگر یہ کہہ رہی تھی کہ مایا تجھے اپنے بھائی پر اعتبار کرنا چاہیے۔ تو دوسری آواز کہہ رہی تھی کہ نہیں، وہ صرف تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے ہمارے بننا ہمارے۔ اس ذہنی کش مکش کے دوران میں اسے گنگو کے یہ الفاظ یاد آئے۔ ”اس کی صورت دیکھ کر تمہارا دل تو پسینے سے جھلنے لگا۔ مایا نے گنگو کی طرف دیکھا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دوں۔“ مایا نے گنگو کی طرف دیکھا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ”میں انصاف کی تلوار تمہارے ہاتھ میں دے چکا ہوں۔ اب تم اپنا وعدہ یاد کرو۔“

جے رام نے مایا کے تذبذب سے پریشان ہو کر کہا۔ ”مایا! تمہیں اب مجھ پر اعتبار نہیں آتا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے ان لوگوں کے انتقام کے خوف سے یہ قصہ نہیں سنایا؟“

جے رام نے درد بھری آواز میں کہا۔ ”مایا! تم یہ کتنا چاہتی ہو کہ میں بزدل ہوں میں موت کے خوف سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھے دوسروں کے سامنے شرمسار نہ کرو۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ لیکن اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں آتا تو یہ میرا خیر

لو اور میرا دل چیر کر دیکھو کہ میرا ہوا بھی تک سرخ ہے یا سفید ہو چکا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے جے رام نے اپنا خنجر مایا کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنا سینہ اس کے سامنے بان کر بولا۔
 ”مایا! تمہیں باپ کے سفید بالوں کی قسم اپنی ماں کے دودھ کی قسم! اگر میں مجرم ہوں، تو یہ خیال نہ کرو کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ میں یہ جاننے کے بعد زندہ نہیں رہنا چاہتا کہ میری بہن بھی مجھے بزدل خیال کرتی ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا دو۔ تمہاری رگوں میں اگر ایک راجپوت کا خون ہے تو اپنے بھائی کے ساتھ رعایت نہ کرو۔“

مایا نے جذبات کی شدت میں غیر شعوری طور پر اپنا ہاتھ جس میں خنجر تھا، بلند کیا۔ جے رام کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھلنے لگی۔ خالد نے کپکپی لی۔ مایا نے عزم و ہمت کے اس پیکر کی طرف ٹٹکی باندھ کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ کاپنے نگہ خالد چلا گیا۔
 تمہارا بھائی معصوم ہے۔“ مایا کے کاپنے ہوئے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ آنکھوں میں آنسو اٹھائے اور وہ بے اختیار جے رام سے لپٹ کر پچکیاں لینے لگی۔ ”بھیا! بھیا! مجھے معاف کر دو۔“

جے رام اس کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بار بار یہ کہہ رہا تھا۔ ”میری بہن! میری ننھی مایا!“

بہن اور بھائی ایک دوسرے سے علمہ کھڑے ہو گئے۔ خالد نے جے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جے رام! مجھے معاف کرنا۔ مجھے تم پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

جے رام نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی شاید یہی کرتا۔“
 خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ہنگامی جوش میں آپ کے منہ پر مکا

رہید کر دیا تھا۔ اب آپ یہ قرض وصول کر سکتے ہیں۔“
 جے رام نے کہا۔ ”نہیں! اب یہ قصہ نہ چھیڑو، ورنہ تمہیں ایک مکا مار کر مجھے گنگو سے دودھ وصول کرنے پڑیں گے۔“

(۳)
 گنگو اپنی زندگی میں کبھی اس قدر پریشان نہیں ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا جے رام نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”گنگو! اگر تم خلوص دل سے زیر انداز اس کے سامنیوں کو چھڑانا چاہتے ہو، تو یہ معاملہ چند دن کے لیے مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے امید ہے کہ راجہ صحیح خطرات سے باخبر ہو کر انہیں قید میں رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا، اور اگر اس نے میری بات نہ سنی، تو میں تمہارے پاسن چلا آؤں گا، اور پھر ہم کوئی اور تدبیر سوچیں گے لیکن خالد کی بہن کہاں ہے؟“
 ”گنگو نے جواب دیا۔ ”وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ جہاز پر زخمی ہو گئی تھی۔“
 ”اب وہ کیسی ہے؟“

اس سوال کے جواب میں خالد بولا۔ ”اب وہ پہلے سے اچھی ہے لیکن زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوا۔ میں مایا دیوی کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے اس کی تیمارداری میں بہت تکلیف اٹھائی ہے۔“

گنگو نے کہا۔ ”جے رام! اگر پرتاپ رائے نے راجہ کے حکم سے جہاز لوٹے ہیں تو مجھے یقین نہیں کہ وہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوگا۔ میرے خیال میں وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ یہ خبر سندھ سے باہر نہ نکلے۔ برہمن آباد میں ایسے قید خانے ہیں جہاں سے صرف موت کی صورت میں انسان باہر نکلتے ہیں اس خبر کو مکران یا بصرے

تک پہنچا ضروری ہے۔ اگر ان کی حکومت نے مداخلت کی تو راجہ یقیناً قیدیوں کو چھوڑ دے گا۔“

جے رام نے کہا: ”اگر خالد جانا چاہے تو میں اسے سرحد کے پار پہنچا دیتے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“

گنگو نے جواب دیا: ”خالد کو میں بھی سرحد کے پار پہنچا سکتا ہوں، لیکن جب تک اس کی بہن تندرست نہیں ہوتی، اس کے لیے جانا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ عربوں کی فوجیں اس وقت ترکستان اور افریقہ میں لڑ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ سپاہیوں کی قلت کے پیش نظر بندھن کے ساتھ بگاڑ پسند نہ کریں۔ خالد کا خیال ہے کہ اگر زیر کسی طرح رہا ہو جائے تو یہ ہم اس کے لیے بہت آسان ہوگی۔ وہ بصرہ اور دمشق کے ہر با اثر آدمی کو جانتا ہے۔“

جے رام نے کہا: ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی زیر کو قید سے نکلانے کی کوشش کروں گا۔“

مایا نے کہا: ”بھیا! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ زیر کی رہائی کی کوشش ضرور کرو۔“

مایا! تجارتی سفارش کے بغیر بھی میرا یہ فرض ہے۔ یہ کہہ کر جے رام گنگو سے مخاطب ہوا: ”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مایا سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

گنگو کا اشارہ پاکڑا اس کے ساتھی وہاں سے کھسک گئے۔ گنگو نے ایک طرف ہو کر خالد سے کہا: ”تم ناہید کے پاس جاؤ، اور اگر وہ قیدیوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو پوچھ آؤ۔“

خالد اندر داخل ہوا تو ناہید دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس نے کہا: ”ناہید“

تمہیں ذرا افادہ ہوتا ہے۔ تو تم چلنے پھرنے لگتی ہو۔ تمہیں بستر پر لیٹنا چاہیے۔“

ناہید نے اس کی بات پر توجہ دیتے بغیر کہا: ”تم نے بیچارے جے رام پر بہت سختی کی۔ اب مایا کے متعلق تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

خالد نے جواب دیا: ”مایا کے متعلق ابھی بہت کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ وہ بہن نہ بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ غالباً وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ جے رام نے زیر کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ رہا ہوتے ہی بحران کے راتے بصرہ پہنچ کر ہماری سرگذشت سنائے گا۔ عورتوں اور بچوں کے رہا ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ہماری حکومت اس معاملے میں مداخلت کرے۔“

ناہید نے کہا: ”میں یہ باتیں سن چکی ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ جن طرح ابا جان کے معاملے میں حکومت بندھ نے بحران کے گورنر کو مار دیا تھا۔ اسی طرح یہ معاملہ بھی رفع دفع ہو جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ بصرہ کا حاکم بہت جا رہے ہیں۔ لیکن بندھ کی طرف متوجہ نہ ہونے کے لیے اس کے پاس معقول تہانہ ہے کہ عرب کی تمام افواج ایشیا اور افریقہ میں بڑھ چکی ہیں۔“

خالد نے پریشان ہو کر کہا: ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لیکن میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“

ناہید نے کہا: ”میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میں بصرہ کے حاکم کو خط لکھتی ہوں اگر جے رام زیر کو رہا کر دے، تو اسے کہو، یہ خط اس کے حوالے کر دے۔ اگر بالفرض میرا خط حاکم بصرہ کو متاثر نہ کر سکا، تو بصرہ کے عوام اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ میں جاؤں گا۔ میں اس خط میں مسلمانوں کو قید خانے کے دروازے توڑتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے اپنے خواب کے صحیح ہونے کا یقین ہے۔“

”تو تم اندر جا کر خط لکھو۔ لیکن کس چیز پر لکھو گی؟“

”ہاں یہ تو میرا دواں۔“ خالد نے

اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ناہید کو رومال دیا اور واپس مڑتے ہوئے کہا: ”تم خط لکھو۔“
 میں اتنی دیر بے رام کو روکتا ہوں۔“
 باہر ملایا اپنے بھائی کو آپ بیتی سنارہی تھی۔ اختتام پر مجھے رام نے پوچھا: ”نایا! تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں؟“
 ”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”گنگو مجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ ناہید مجھے اپنی چھوٹی بہن خیال کرتی ہے۔“
 ”جے رام نے کہا: ”نایا! میں تمہیں ایک بہت بری خبر سنانا چاہتا ہوں۔“
 ”مایا نے گھبرا کر پوچھا: ”وہ کیا؟“
 ”بات یہ ہے کہ میں تمہیں اس وقت اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ میں نے تمہارے غائب ہونے کی ذمہ داری پر تاپ رانے پر تھوپی تھی۔ لیکن جب اس نے زبیر اور علی کو اذیت دینا شروع کی تو مجھے ان کی جانیں بچانے کے لیے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ تم میرے ساتھ نہ تمہیں۔ اب اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو مجھے ناہید اور خالد کا پتہ بتانے پر مجبور کیا جائے گا۔ میں ایذا پر خود راجہ کی سختی سے نہیں ڈرتا لیکن پرتاپ رانے کو شک ہو جائے گا اور وہ ناہید اور خالد کی تلاش شروع کر دے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں دیکھ کر انہیں خالد اور ناہید کے ردپوش ہونے کا شک ہو۔ اگر تم چڑدن اور میرا رہنا گوارا کرو تو پرتاپ رانے غالباً تین چار روز تک واپس دیلا جلا جائے گا۔ اس کے بعد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“
 ”مایا نے اطمینان سے جواب دیا: ”جیسا آپ میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں ہر طرح خوش ہوں اور جب تک ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ میں اسے چھوڑ کر جانا پسند بھی نہیں کروں گی۔“

گنگو اور خالد کچھ فاصلے پر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جے رام نے انہیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشارے سے اپنے پاس بلا لیا جب قریب پہنچے تو اس نے کہا: ”آپ کو کہیں پھر شک نہ ہو جائے کہ میں کوئی سازش کر رہا ہوں۔ نایا کہتی ہے کہ وہ ناہید کے تندرست ہونے تک یہیں رہنا چاہتی ہے اور میں بھی بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے یہاں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں چند دنوں تک اسے لے جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ مجھے بھی زبیر کے ساتھ فرار ہونا پڑے اور میں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ آملوں۔ اب مجھے دیر ہو رہی ممکن ہے کہ راجہ پرتاپ رانے کے شہر میں پہنچتے ہی ہمیں ملاقات کے لیے بلا لے۔ میرا غیر حاضر ہونا ٹھیک نہیں۔“
 ”خالد نے کہا: ”آپ ذرا ٹھہریے۔ ناہید ایک خط لکھ رہی ہے۔ آپ یہ خط زبیر کو آزاد کروانے کے بعد اس کے حوالے کر دیں۔“
 ”نایا“ تو جلد ہی بٹھے وہ خط لے آؤں مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ بزہمن آباد کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔“
 ”گنگو نے کہا: ”تم فکر نہ کرو۔ ہم ان سے پہلے تمہیں ایک آسان راستے سے بزہمن آباد پہنچا دیں گے۔“
 ”جے رام نے کہا: ”میں فقط آپ کا ایک ساتھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ بزہمن آباد میں اسے کوئی نہ پہچانتا ہو۔ اگر کوئی نازک وقت آیا تو میں اسے آپ کے پاس اطلاع دینے کے لیے روانہ کر دوں گا۔“
 ”گنگو نے کہا: ”آپ واسو کو لے جائیں۔“

دوپہر کے وقت جے رام واسو کی راہنمائی میں جنگل عبور کر رہا تھا۔

تصدیق کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے راجہ سے شکایت کی کہ تمھاری بہن کے علاوہ ایک مسلمان لڑکی بھی جہاز سے غائب ہوئی ہے تو ممکن ہے کہ راجہ مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرائے؟

”میں راجہ کے سامنے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میری بہن جہاز پر نہیں تھی اور مسلمان لڑکی کے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی صحیح نہیں۔“

”لیکن جب قیدی یہ شکایت کرنے لگے کہ وہ جہاز سے غائب ہوئی ہیں تو تمھارا بیان راجہ کو مطمئن نہ کر سکے گا۔“

بے رام نے پریشان ہو کر کہا: ”آج آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ پہلے آپ نے زیر اور علی کو اذیت پہنچا کر مجھے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ میری بہن غائب نہیں ہوئی اور اب آپ یہ ثابت کرنے پر مصر ہیں کہ عرب لڑکی اور میری بہن جہاز سے غائب ہوئی ہیں۔“

پرتاپ رائے نے جواب دیا: ”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی مجبوری ہے جس نے تمھیں اپنی بہن کا راز چھپانے پر مجبور کیا ہے؟“

”آپ یہ جانتے ہیں کہ زیر میرا مہمان تھا۔ اس نے میری جان بچائی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اس واقعہ کی آڑ لے کر اسے اذیت پہنچائیں۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم صرف زیر کی خاطر اپنے صحیح دعوے سے دست بردار ہوئے۔ تم زیر کی دوستی پر اپنی بہن کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو لیکن تمھارا دل

یہ گواہی دیتا ہے کہ تمھاری بہن کو میں نے اغوا کیا ہے اور صرف تمھاری بہن ہی نہیں بلکہ ایک عرب لڑکی اور لڑکے کے غائب ہو جانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی عاید ہوتی ہے۔“

بے رام نے جواب دیا: ”نہیں نہیں!! مجھے آپ کے متعلق جو غلط فہمی تھی وہ

میں ابھی تک مہاراج سے نہیں ملا اور نہ میری یہ نیت تھی۔“

پرتاپ رائے نے مطمئن ہو کر کہا: ”بے رام! میرا خیال ہے کہ اپنی بہن کے غائب ہو جانے کے متعلق تم نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میں عربوں کے علاوہ سرانڈپ کے قیدیوں سے بھی پوچھ چکا ہوں۔ وہ سب تمھارے پہلے بیان کی

برہمن آباد سے ایک کوس کے فاصلے پر بے رام کو اپنا قافلہ دکھائی دیا۔ اس نے داسو کے ساتھ قافلے میں شریک ہونا خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا راستہ تبدیل کر دیا اور دوسرے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ برہمن آباد میں نرائن داس نامی ایک نوجوان اس کا پڑانا دوست تھا۔ بے رام نے داسو کو اس کے گھر ٹھہرا

کر شاہی مہمان خانے کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ رائے سپاہیوں اور قیدیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بے رام کو دیکھتے ہی کہتے ہوئے: ”مجھ سے تم نے شکار کا بہانہ کیوں کیا؟ تم نے صاف یہ کیوں نہ بتایا کہ تم مجھ سے پہلے مہاراج

سے ملنا چاہتے تھے، اب بتاؤ! تمھاری بہن کی کہانی سننے کے بعد مہاراج نے کیا کہا؟“

”میں ابھی تک مہاراج سے نہیں ملا اور نہ میری یہ نیت تھی۔“

پرتاپ رائے نے مطمئن ہو کر کہا: ”بے رام! میرا خیال ہے کہ اپنی بہن کے غائب ہو جانے کے متعلق تم نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میں عربوں کے علاوہ

سرانڈپ کے قیدیوں سے بھی پوچھ چکا ہوں۔ وہ سب تمھارے پہلے بیان کی

برہمن آباد سے ایک کوس کے فاصلے پر بے رام کو اپنا قافلہ دکھائی دیا۔ اس نے داسو کے ساتھ قافلے میں شریک ہونا خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا راستہ تبدیل کر دیا اور دوسرے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ برہمن آباد میں نرائن داس نامی ایک نوجوان اس کا پڑانا دوست تھا۔ بے رام نے داسو کو اس کے گھر ٹھہرا

کر شاہی مہمان خانے کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ رائے سپاہیوں اور قیدیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بے رام کو دیکھتے ہی کہتے ہوئے: ”مجھ سے تم نے شکار کا بہانہ کیوں کیا؟ تم نے صاف یہ کیوں نہ بتایا کہ تم مجھ سے پہلے مہاراج سے ملنا چاہتے تھے، اب بتاؤ! تمھاری بہن کی کہانی سننے کے بعد مہاراج نے کیا کہا؟“

[illegible]

زیر کو سمجھا سکتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ میرے کہنے پر راجہ کے سامنے جھوٹی شکایت نہیں کرنے گا۔

پرتاپ رائے نے بے رخی سے کہا: ”تم کسی قیدی سے بات چیت نہیں کر سکتے۔ میں نے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ راجہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے تمہیں اپنا صندوق کھول کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔“

بچے رام کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فوج کے ایک افسر نے آکر پرتاپ رائے کو اطلاع دی کہ مہاراج آپ کو یاد فرماتے ہیں۔“

بچے رام نے پرتاپ رائے کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے کہا: ”مہاراج نے مجھے یاد فرمایا ہے تمہیں نہیں تم اطمینان سے بیٹھ رہو! جب تمہیں بلایا جائے گا میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا۔“

پرتاپ رائے جہاز سے لوٹا ہوا مال اٹھوا کر چلا گیا اور بچے رام پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ زبیر باقی قیدیوں کے ساتھ ہی ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے اندر جھانک کر دیکھا لیکن پرے دار نے اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ بچے رام نے ایک معمولی پیرنے دار کا یہ سلوک دیکھ کر زبیر اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو یقین ہونے لگا کہ وہ ان کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے راجہ کے ایک سپاہی نے جے رام کو اطلاع دی کہ ہمارا آج آپ کو بلاتے ہیں۔ جے رام کا ٹھیا دار کے راجہ کے مخالف کا صندوق اٹھوا کر راجہ کے محل میں پہنچا۔ پھر دارا سے محل کے ایک کمرے میں گئے۔

راجہ داہر سنگ مرمر کے چبوترے کے اوپر سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ رائے کے علاوہ دیبل کا حاکم اعلیٰ اور سینا پتی اودھ سنگھ اور اس کا نو جوان بیٹا بھی سنگھ جوارور سے راجہ کے ساتھ آئے تھے، اس کے سامنے کھڑے تھے۔ جے رام نے راجہ کو تین بار جھک کر پرنام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو سپاہیوں نے آبنوس کا صندوق راجہ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ جے رام نے راجہ کے حکم سے صندوق کھولا۔ راجہ نے جواہرات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر پرتاپ رائے کی طرف دیکھا اور جے رام سے سوال کیا: ”ہم نے سنا ہے کہ تم عربوں کی حمایت کرنا چاہتے ہو۔ تم نے ہمارے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ ہم عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور تم نے ہمارے وفادار پرتاپ رائے پر شہمت لگانے کے لیے ایک عرب لڑکی اور اپنی بہن کو کہیں چھپا دیا ہے؟“

جے رام نے جواب دیا: ”اُن داتا! مجھے یہ یقین نہ تھا کہ پرتاپ رائے نے آپ کے حکم سے ان کے جہازوں کو ٹوٹا تھا، ان کا دیبل میں بٹھرنے کا ارادہ نہ تھا۔ انھوں نے مجھے راستے میں بحری ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا۔ دیبل میں میں اپنے مہمان بنا کر لایا تھا اور اپنے مہمانوں کی رکشاً ایک راجپوت کا دھرم ہے۔ عرب لڑکی اور اپنی بہن کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جب جہاز

سندھ کا دارالحکومت ضلع نواب شاہ میں بیرانی کے قریب ایک قدیم شہر کے گھنڈرات موجود ہیں، جسے دلور کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے خیال میں دلور اردور کی بگڑی ہوئی صورت ہے لیکن بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اردور کا شہر موجودہ روہڑی کے آس پاس آباد تھا۔ اور دریائے سندھ نے اُس کا نشان تک نہیں چھوڑا۔

لوٹے جا رہے تھے میں ایک کوٹھری میں بند تھا۔“

”تم نے پرتاپ رائے سے یہ کہا تھا کہ تم نے عربوں کو اس کی قید سے چھڑانے کے لیے یہ بہانہ تراشا تھا؟“

”اُن داتا! میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن.....!“

راجہ نے سخت لہجے میں کہا: ”ہم کچھ نہیں سنا چاہتے۔ اگر عربوں نے شکایت کی کہ جہاز پر سے ان کی ایک لڑکی غائب ہوئی ہے تو تمہیں اس لڑکی کو ہمارے حوالے کرنا پڑے گا۔“

”مہاراج! اگر عرب مجھ پر یہ شبہ ظاہر کریں کہ لڑکی کو میں نے اغوا کیا ہے تو میں ہر سزا بھگتے کے لیے تیار ہوں۔“

”ہم تمہاری چال اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر عربوں نے تمہیں قصور وار نہ ٹھہرایا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اُن کی مرضی سے لڑکی کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں۔ جن سے انھیں سچ بولنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔“

”اُن داتا! اگر آپ مجھے قصور وار ٹھہراتے ہیں تو جو سزا جی میں آئے دے لیں، لیکن عربوں کے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہو چکی ہے۔“

”تو تم ہمارے دشمنوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہو؟“

”وہ آپ کے دشمن نہیں۔ وہ سندھ کو عرب کا ایک پُر امن ہمسایہ خیال کرتے تھے۔ ورنہ وہ دیبل کے قریب سے بھی نہ گزرتے تھے۔ اگر وہ نیک نیت نہ ہوتے تو جواہرات کا یہ صندوق جو میں مہاراجہ کا ٹھپا دار کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، آپ تک نہ پہنچتا۔“

راجہ نے کہا: ”کاٹھیاوار کے جواہرات سرانڈیپ کے جواہرات کے مقابلے میں پتھر معلوم ہوتے ہیں۔“

”مہاراج! میں جوہری نہیں، ایک سپاہی ہوں، میں پتھروں کو نہیں پہچانتا لیکن آپ کے دوست اور دشمن کو پہچانتا ہوں۔ میں ان پتھروں کے ساتھ آپ کی خدمت میں مہاراجہ کا ٹھیاوار کی دوستی کا پیغام لایا ہوں۔ ان پتھروں کی قیمت اگر ایک کوڑی بھی نہ ہو تو بھی وہ ہاتھ جو آپ کے سامنے یہ ناچیز تحائف پیش کر رہا ہے بہت قیمتی ہے لیکن پرتاپ رائے نے عرب حبشی پڑامن اور طاقت ور ہمسایہ سلطنت کے جہاز لوٹ کر جو کچھ آپ کے لیے حاصل کیا ہے۔ وہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ ان داتا! آپ کو مسلمانوں سے دشمنی مول لینے سے پہلے بہت سوچ بچار سے کام لینا چاہیے۔ ان کا ہاتھ ہر ہاتھ سے مضبوط ہے اور ان کا لوہا ہر لوہے کو کاٹتا ہے۔ وہ جیٹھ کی آندھیوں کی طرح اٹھتے ہیں اور ساون کے بادلوں کی طرح چھا جاتے۔ ان کے مقابلے پر آنے والوں کو نہ سمندر پناہ دے سکتے ہیں نہ پہاڑ۔ ان کے گھوڑے پانی میں تیرتے اور ہوا میں اڑتے ہیں۔ آپ نے برسات میں دریائے سندھ کی لہریں دیکھی ہیں، لیکن ان کی فتوحات کا سینلاب اس سے کہیں زیادہ تند اور تیز ہے۔“

راجہ داہری کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے چلا کر کہا: ”ڈرپوک گیدڑ! تمہاری رگوں میں راجپوت کا خون نہیں۔ میرے ملک میں تمہارے جیسے بزدل آدمی کا کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

”ان داتا! میں اس وقت مہاراجہ کا ٹھیاوار کا ایلچی ہوں۔ میں خود ایسے ملک میں نہیں رہنا چاہتا جس میں دوست کو دشمن اور دشمن دوست خیال کیا جائے۔“

”کاٹھیاوار کا راجہ اگر خود بھی یہاں موجود ہوتا تو بھی میں یہ الفاظ سننے کے بعد اس کا سر قلم کر دیتا۔ پرتاپ رائے! اسے لے جاؤ! ہم کل اس کی سزا کا فیصلہ کریں گے۔ صبح عربوں کے سرغنہ کو ہمارے سامنے پیش کرو۔“

پرتاپ رائے نے سپاہیوں کو آواز دی اور آٹھ آدمی منگی تلواریں لینے موجود۔

ہوئے۔ پرتاپ رائے نے بچے رام کو چلنے کا اشارہ کیا، بچے رام منگی تلواروں کے پھرنے میں پرتاپ رائے کے آگے چل دیا۔

اودھے سنگھ، بچے رام کی تقریر کے دوران میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک سر بھرا نوجوان اس کے اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس نے کہا: ”ان داتا! اگر مجھے اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔“

راجہ نے جواب دیا: ”تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اُسے ایسی سزا دیں گے جو برہمن آباد کے لوگوں کو دیر تک نہ بھولے۔“

اودھے سنگھ نے کہا: ”لیکن مہاراج! میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا ہے نیک نیتی سے کہا ہے۔ ہمیں چند ہاتھیوں اور جواہرات کے لیے عربوں کے ساتھ دشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔ ہمیں اپنی طاقت پر بھروسہ ہے لیکن غرب نہایت سخت جان دشمن ہیں۔“

راجہ نے کہا: ”اودھے سنگھ! ایک گیدڑ کی چیخیں سن کر تم بھی گیدڑ بن گئے یہ عرب اونٹنیوں کا دودھ پینے والے اور جو کی روکھی سوکھی روٹی کھانے والے ہمارے مقابلے کی جرات کریں گے؟“

”مہاراج! وہ اونٹنیوں کا دودھ پی کر شیروں سے لڑتے ہیں جو کی روٹی کھا کر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اونٹنوں پر چڑھ کر ہمارے ہاتھیوں کے مقابلے کے لیے آئیں گے؟“

”ان داتا! برانہ مانیے! ان کے اونٹ ایران کے ہاتھیوں کو شکست دے چکے ہیں۔“

راجہ نے غصے میں آکر کہا: ”اودھے سنگھ! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم

عربوں کو لڑتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن میں مکران کی جنگ میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ عام عرب سپاہی ہمارے بڑے سے بڑے پہلوان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مکران پر عربوں نے کل چھ سو سواروں کے ساتھ حملہ کیا تھا اور راجہ کے چار ہزار سپاہیوں کو تنکوں کی طرح بنائے گئے تھے۔ جے رام کو آپ دیر سے جانتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اس سے بڑھ کر تلوار کا دھنی اور کوئی نہیں۔ اگر وہ عربوں سے اپنی قدر مرعوب ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بُزدل یا مہاراج کا نمک حرام ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عربوں سے بگاڑ کے خطرے کا صحیح اندازہ نہ کر چکا ہے۔“

راجہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم میرے سینا پتی ہو وزیر نہیں اور میں ان معاملات میں تمہاری سمجھ سے کام نہیں لینا چاہتا اگر بڑھاپے میں تمہاری محنت جواب دے چکی ہے تو تمہیں اس عہدہ سے سبکدوش کیا جاسکتا ہے اور تمہیں یہ بھی حق نہیں کہ تم جے رام جیسے سرکش، گستاخ اور بُزدل کی سفارش کرو۔ وہ جو کچھ ہمارے سامنے کہہ چکا ہے وہ اسے بڑی سے بڑی سزا دینے کے لیے کافی ہے۔“

اودھے سنگھ راجہ کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے کہا۔ ”مہاراج! میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اتنی باتیں کرنے کی جرأت اس لیے کی کہ ابھی تک آپ نے عرب کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا اگر آپ اعلان جنگ کر چکے ہوں تو میرا فرض ہے اور صرف میرا ہی فرض نہیں بلکہ ہر سپاہی کا یہ فرض ہے کہ آپ کی فتح کے لیے اپنی جان قربان کر دے۔ جے رام کی گستاخی کا مجھے افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقت آنے پر وہ بھی ایک وفادار راجپوت ثابت ہوگا۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو ہمیں آج ہی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم عربوں کو ایسی شکست دیں کہ وہ پھر سہرا ٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں۔“

عربوں کے متعلق سنی سنائی باتوں سے مرعوب ہو جاؤ گے، ہم عرب کی سپاری آبادی سے زیادہ سپاہی میدان میں لاسکتے ہیں۔ راجپوتانہ کے تمام راجہ ہمارے ایشائے پر گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہوں گے۔“

اودھے سنگھ نے کہا۔ ”مہاراج! مجھے ان کا خوف نہیں لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمیں سوئے ہوئے فتنے کو جگانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ دو مہینوں کی مدد کے بھروسے پر ایک طاقتور دشمن سے لڑائی مول لینا ٹھیک نہیں۔“

”اودھے سنگھ! تم بار بار کیا کہہ رہے ہو؟ سندھ کے سامنے عرب کے صحرائی ایک طاقتور دشمن کی حیثیت پر گزرتے نہیں دیکھتے۔ آخر عربوں میں کیا خوبی ہے۔“

جے رام نے سپاہیوں میں نہیں؟ ”مہاراج! ایسے دشمن کا کوئی علاج نہیں جو موت سے نہ ڈرتا ہو۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین نہ ہو تو آپ قیدیوں میں سے ایک عرب کو لاکر اس کا امتحان لے لیں۔ تلواریں ان کے کھلونے ہیں۔“

راجہ نے اودھے سنگھ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”کیوں بھیم سنگھ! تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ ہمارے سپاہی عربوں کے مقابلے میں کمزور ہیں؟“

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج! پتہ چلی عربوں کے ساتھ پر امن رہنے میں بھلائی سمجھتے ہیں اور نہ ہم نے بھی تلواروں کے سائے میں پرورش پائی ہے، اگر عرب موت سے نہیں ڈرتے تو ہمیں مارنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔“

راجہ نے کہا۔ ”شاباش! دیکھا اودھے سنگھ! تمہارا بیٹا تم سے بہادر ہے۔“

اودھے سنگھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج کے منہ سے یہ سن کر مجھے خوش ہونا چاہیے لیکن سینا پتی کے فرائض کا احساس مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں مہاراج کے سامنے آنے والے خطرات کو گھٹا کر پیش نہ کروں۔ بھیم سنگھ ابھی بچہ ہے۔ اس نے

منفق کیا۔ سندھ کے دارالحکومت ارد سے اس کا وزیر بھی برہمن آباد پہنچ چکا تھا وزیر سیناپتی اور برہمن آباد کے امرا حسب مراتب تخت کے قریب کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ وزیر اور سیناپتی کے بعد تیسری کرسی جس پر پہلے برہمن آباد کا گورنر بیٹھا تھا۔ اب دیبل کے گورنر کو دی گئی تھی اور برہمن آباد کا گورنر راجہ سے چند بالشت دور ہو جانے پر یہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت نے راجہ اور اس کے درمیان پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں۔ راجہ کے بائیں ہاتھ پانچویں کرسی پر بھیمن سنگھ برہمان تھا۔ باقی امرا بائیں طرف دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے پیچھے پندرہ بیس عہدے دار دائیں بائیں دو قطاروں میں کھڑے تھے۔ تخت پر راجہ کے دائیں اور بائیں دو انیاں رونق افروز تھیں۔ ایک حسین و جمیل لڑکی راجہ کے پیچھے صراحی اور جام لیے کھڑی تھی۔ درباری شاعر نے مترنم آواز میں راجہ کی تعریف میں چند اشعار پڑھے۔ اس کے بعد کچھ دیر رقص و سرود کی محفل گرم رہی۔ راجہ نے شراب کے چند جام پیے اور قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی زبیر کو پاہ زنجیر دربار میں لے آئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد راجہ داخل ہوا۔ زبیر کی طرح اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں نہ تھیں لیکن اس کے آگے پیچھے نگلی تلواروں کا پرہ زبیر کو یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ اس کی حالت اس سے مختلف نہیں۔

راجہ نے پر تاپ رائے کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہماری زبان جانتا ہے؟“
اس نے اٹھ کر جواب دیا۔ ”جی ہمارا ج! یہ اجنبی زبانیں سیکھنے میں بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔“

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟

”زبیر!“ اس نے جواب دیا۔

راجہ نے کہا۔ ”ہم نے سنا ہے کہ تم ہم سے بات کرنے کے لیے بہت

اس مقصد کے لیے ہمیں افواج منظم کرنے کے علاوہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے تمام چھوٹے اور بڑے راجوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ وہ سب آپ کا لوہا ماننے ہیں اور آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر لڑنا اپنے لیے باعث فخر سمجھیں گے۔ ہمیں کاٹھیاواڑ کے راجہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے آپ کو تحالف نہیں بھیجے، خراج بھیجا ہے۔ اگر آپ بے رام کا جرم معاف کر دیں تو اس کی وساطت سے جنگ میں بھی ہمارا راجہ کا ٹھیاوار کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

راجہ نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ ”اب تم ایک راجپوت کی طرح بول رہے ہو لیکن بے رام عربوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ اگر اسے معاف بھی کر دیا جائے تو اس بات کا کیا ثبوت کہ وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ ہاں! میں نے سنا ہے کہ وہ ایک عرب لوجوان کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو جائے اور اسے تلوار کے مقابلے میں مغلوب کرے تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔“

”ہمارا ج! وہ آپ کا اشارہ پا کر پہاڑ کے ساتھ ٹھکر لگانے کے لیے بھی تیار ہو گا۔“
”یہ بہت اچھا! ہم تمہاری سفارش پر اسے موقع دیں گے۔ کل ہم بے رام کی نیک نیتی کے علاوہ تلوار چلانے میں ایک عرب کی مہارت بھی دیکھ لیں گے۔“
راجہ نے اس کے بعد مجلس برخاست کی اور اٹھ کر محل کے دروازے

کرنے میں چلا گیا۔ (۳۰)

اگلے دن راجہ داہرائے برہمن آباد کے محل کے ایک کشادہ کمرے میں دربار

بے چین تھے۔ کہو کیا کتنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دیبل کی بندرگاہ پر ہمارے جہاز کیوں ٹوٹے گئے اور ہمیں قیدی بنا کر ہمارے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟“

راجہ نے قدرے بے چین ہو کر جواب دیا: ”نوجوان! ہم پہلے سن چکے ہیں کہ عربوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں لیکن تمہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خاطر ذرا ہوش سے کام لینا چاہیے۔“

زیر نے کہا: ”ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اگر آپ کو اس کا علم نہیں تو یہ اور بات ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ دیبل کے گورنر نے بغیر کسی وجہ کے ہم پر دست درازی کی۔ اگر آپ کو ہمارے متعلق کوئی غلط فہمی ہو تو ہم اسے دور کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اگر سندھ کی طرف سے یہ قدم ہماری غیرت کا امتحان لینے کی نیت سے اٹھایا گیا ہے، تو ہم والی سندھ کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے اچھوت نہیں جن کی فریاد ان کے گلے سے باہر نہیں آ سکتی۔ آج تک ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی اور سندھ کی سلطنت کو میں ایسی سلطنت نہیں سمجھتا، جو ایران کی زرہیں اور روما کے خود کاٹنے والی شمشیروں کی ضرب برداشت کر سکے۔ وہ قوم جو روئے زمین کے ہر مظلوم کی داد رسی اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اپنی بو بیٹیوں کی بے عزتی پر خاموش نہیں بیٹھے گی۔“

راجہ نے وزیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”سنو ایک قیدی ہمارے خلاف اعلان جنگ کر رہا ہے۔“

وزیر نے جواب دیا: ”مہاراج! یہ عرب بہت باتونی ہیں۔ ایران اور روم کی فتوحات نے انھیں مغرور بنا دیا ہے لیکن انھیں سندھ کے شیروں سے واسطہ نہیں پڑا۔“

زیر نے جواب دیا: ”ہم نے دیبل میں شیروں کی شجاعت نہیں دیکھی، لومڑیوں کی مکاری دیکھی ہے۔“

زیر کے ان الفاظ کے بعد تمام درباری ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اودھے سنگھ موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اٹھا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا: ”مہاراج! چند دن قید میں رہ کر یہ نوجوان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اور پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سپاہی کی تلوار کند ہو۔ اس کی زبان بہت تیز ہوتی ہے۔“

زیر غصے کی حالت میں اودھے سنگھ کی دوستانہ مداخلت کا مطلب نہ سمجھ سکا اور بولا: ”مجھ پر پیچھے سے وار کیا گیا ہے، ورنہ میری تلوار کے متعلق تمہاری یہ رائے نہ ہوتی۔“

پرتاپ رائے نے اٹھ کر کہا: ”مہاراج! یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ہم نے اسے لڑکر گرفتار کیا تھا۔“

زیر نے غصے اور سخاوت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ”بزدل آدمی! تم انسانیت کا ذلیل ترین نمونہ ہو۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود تمہارے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار ظاہر ہیں۔ لومڑی شیر کو پنجرے میں بھی دیکھ کر بدحواس ہے۔ میرا صرف ایک ہاتھ کھول دو اور مجھے میری تلوار دے دو۔ پھر ان سب کو میرے اور تمہارے دعویٰ کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔“

پرتاپ رائے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حاضرین دربار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برہمن آباد کا گورنر زیر کی آمد کو تائید غیبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دربار کا سکوت توڑا اور کہا: ”مہاراج! یہ کھستری دھرم کی توہین ہے کہ ایک معمولی عرب مجھے دربار میں سردار پر تاپ رائے کو بزدلی کا طعنہ دے۔ آپ سردار پر تاپ رائے کو اجازت دیں کہ وہ اس کا دعویٰ جھوٹ ثابت کر دکھائیں۔“

اودھے سنگھ کو پرتاپ رائے سے کم نفرت نہ تھی لیکن وہ جے رام کو راجہ کے عتاب سے بچانا زیادہ ضروری خیال کرتا تھا اور اُسے بچانے کی اس کے ذہن میں یہی صورت تھی کہ جے رام زبیر کا مقابلہ کر کے راجہ کے شکوک رفع کر دے کہ وہ عربوں کا دوست ہے۔ اس نے اُٹھ کر کہا: ”ہمارا ج! برہمن آباد کے عاکم کا خیال درست نہیں۔ سردار پرتاپ رائے کا رتبہ ایسا نہیں کہ وہ ایک معمولی عرب سے مفت بلہ کریں، یہ ان کی توہین ہے۔ اس نوجوان کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہمارے پاس ہزاروں نوجوان موجود ہیں۔ اگر ہمارا ج کونا گوار نہ ہو تو آپ جے رام کو یہ ثابت کرنے کا موقع دیں کہ وہ یلچہ عربوں کا دوست نہیں۔“

راجہ نے جواب دیا: ”تم کئی بار جے رام کی سفارش کر چکے ہو لیکن اس کی باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ عربوں سے بہت زیادہ مرعوب ہے۔ کیوں جے رام! تم اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے تیار ہو؟“

جے رام نے ملجیانا انداز میں کہا: ”ہمارا ج! میں آپ کے اشارے پر آگ میں کود سکتا ہوں لیکن زبیر میرا مہمان ہے اور میں اس پر تلوار نہیں اٹھا سکتا۔“ دربار میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اودھے سنگھ نے دل برداشتہ ہو کر جے رام کی طرف دیکھا۔ راجہ نے چلا کر کہا: ”اس گدھے کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ اس کا منہ کالا کر کے پتھر سے بند کر دو اور شہر کی گلیوں میں پھراؤ۔ کل اسے مست ہاتھی کے سامنے ڈالا جائے گا۔ اودھے سنگھ! تم نے اس عرب کے سامنے ہمیں شرمسار کیا اور پرتاپ رائے! تم چپ کیوں بیٹھے ہو۔ تم دیبل ہیں اسے نیچا دکھا چکے ہو۔ اب تمہاری تلوار نیام سے باہر کیوں نہیں آتی؟ تم سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا؟“

نوجوان بھیم سنگھ نے اُٹھ کر تلوار بے نیام کی اور کہا: ”ہمارا ج! مجھے اجازت

دیکھیے!“

بھیم سنگھ کی دیکھا دیکھی تمام درباریوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ سب سے آخر میں پرتاپ رائے نے تلوار نکالی لیکن اس کی نگاہیں راجہ سے کہہ رہی تھیں۔ ”ان داتا! میرے حال پر رحم کرو۔“ درباریوں کو راجہ کے اشارے کا منتظر دیکھ کر زبیر نے اپنے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ”بس اب جانے دیجیے! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اپنے حریف کو پاہ زنجیر دیکھ کر آپ کے درباری بزدل کہلانا پسند نہیں کرتے لیکن قدرت کوٹریوں کے سامنے شیردوں کو ہمیشہ باندھ کر پیش نہیں کرتی۔“

بھیم سنگھ نے کہا: ”ہمارا ج! اس کی بیڑیاں کھلواد دیجیے۔ میں اسے ابھی بتا دوں گا کہ شیر کون ہے اور کوٹری کون!“

(۴)

راجہ کے اشارے پر سپاہیوں نے زبیر کی بیڑیاں اتار دیں اور اس کے ہاتھ میں ایک تلوار دے دی گئی لیکن وزیر نے کہا: ”ہمارا ج! آپ کے دربار میں مقابلہ ٹھیک نہیں۔“

راجہ نے جواب دیا: ”ٹھیک کیوں نہیں؟ اسی دربار میں ہمارے سپاہیوں کو بزدلی کا طعنہ دیا گیا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اس کا انتقام لیا جائے۔“ ”ہمارا ج! انتقام اس نوجوان کو لڑنے کا موقع دینے بغیر بھی لیا جاسکتا ہے۔“

راجہ نے جواب دیا: ”نہیں! ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ عرب تلوار کس طرح چلاتے ہیں۔“

بھیم سنگھ کر سیوں کے درمیان کھلی جگہ میں اکھڑا ہوا اور اس نے تلوار کے اشارے سے زیر کو سامنے آنے کی دعوت دی۔

زیر نے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا: ”اس نوجوان کے ساتھ مجھے کوئی دشمنی نہیں۔ میرا مجرم پر تاپ رائے ہے۔ آپ اسے قربانی کا بکرا کیوں بناتے ہیں؟“
بھیم سنگھ نے کہا: ”بزدل! تم صرف باتیں کرنا جانتے ہو۔ اگر ہمت ہے تو سامنے آؤ۔“

”اگر تم دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر بضد ہو تو تمھاری مرضی“ یہ کہتے ہوئے زیر آگے بڑھ کر بھیم سنگھ کے سامنے اکھڑا ہوا۔ راجہ کے حکم سے سپاہی تخت اور کرسیوں کے آگے نصف دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ اودھے سنگھ نے اٹھ کر کہا: ”بیٹا! اوچھا وار نہ کرنا۔ تم ایک خطرناک دشمن کے سامنے کھڑے ہو۔“

”پتا جی! آپ فکر نہ کریں“ یہ کہتے ہوئے بھیم سنگھ نے یکے بعد دیگرے تین چار وار کر دیے۔ زیر اس حملے کی غیر متوقع شدت سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور اہل دربار نے خوشی کا غرہ بلند کیا۔ زیر کچھ دیر بھیم سنگھ کے وار روکنے پر اکتفا کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تماشائی یہ محسوس کرنے لگے کہ حملہ کرنے والے ہاتھ سے حملہ روکنے والا ہاتھ کہیں زیادہ پھرتیلا ہے۔ اودھے سنگھ پھر چلایا: ”بیٹا! جوش میں نہ آؤ! تلوار کا ٹھنڈا کھلاڑی ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔“

لیکن زیر کے چہرے کی پرسکون مسکراہٹ نے بھیم سنگھ کو اور زیادہ سنج پا کر دیا اور وہ اندھا دھند وار کرنے لگا۔ اسے آپے سے باہر آتا دیکھ کر زیر نے یکے بعد دیگرے چند وار کیے اور بھیم سنگھ کو جارحانہ حملوں سے مدافعت پر مجبور کر دیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بھیم سنگھ کی تلوار بروقت مدافعت کے لیے نہ اٹھ سکی لیکن زیر کی تلوار اسے گھائل کرنے کی بجائے اس کے جسم کے کسی حصے کو چھونے کے

بعد واپس چلی گئی۔ دبدادی اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ جان بوجھ کر بھیم سنگھ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھیم سنگھ کو خود بھی اس کی برتری کا احساس ہو چکا تھا لیکن وہ اعتراف شکست پر موت کو ترجیح دینے کے لیے تیار تھا۔ پر تاپ رائے بھیم سنگھ کے باپ سے پرانی رنجشوں کے باوجود انتہائی خلوص سے بھیم سنگھ کی فتح کی دعائیں کر رہا تھا لیکن بھیم سنگھ کے بازو ڈھیٹے پڑ چکے تھے، راجہ اور اہل دربار کے چہروں پر مایوسی چھا رہی تھی۔

اودھے سنگھ نے کہا: ”مہاراج! بھیم سنگھ اپنی جان دے دے گا لیکن پیچھے نہیں ہٹے گا۔ آپ اس کی جان بچا سکتے ہیں۔“

بڑی رانی نے اودھے سنگھ کی سفارش کی لیکن چھوٹی رانی نے کہا: ”مہاراج! سپاہیوں کو بھیم سنگھ کی مدد کا حکم دینا انصاف نہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے اودھے سنگھ کے بیٹے نے جوش مارا ہے لیکن جب وہ پردیسی دو قدم پیچھے ہٹا تھا، اس پر کسی کو رحم نہ آیا۔ اگر آپ بچانا چاہتے ہیں تو دونوں کی جان بچائیے!“

راجہ تذبذب کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اچانک زیر پے درپے چند سخت وار کرنے کے بعد بھیم سنگھ کو چاروں اطراف سے دھکیل کر اس کی خالی کرسی کے سامنے لے آیا۔ سپاہی جو ننگی تلواریں لیے قطار میں کھڑے تھے۔ ادھر ادھر سمت گئے۔ بھیم سنگھ لڑکھڑاتا ہوا پیٹھ کے بل کرسی میں گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن زیر نے اس کے سینے پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا: ”تم اگر چند سال اور زندہ رہو تو ایک اچھے خاصے سپاہی بن سکتے ہو لیکن سرِ دست تمھاری جگہ یہ کرسی ہے۔“

بھیم سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ غصے اور ندامت کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

راجہ نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا لیکن ان کی تلواریں بلند ہونے سے پہلے زہیر بھیم سنگھ کی کرسی کے اوپر سے کود کر پرتاپ رائے کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور پیشتر اس کے کہ پرتاپ رائے اپنی بدحواسی پر تالو پاتا۔ زہیر نے اپنی تلوار کی نوک اس کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے راجہ سے کہا: "اپنے سپاہیوں کو وہیں کھڑا رہنے کا حکم دیجیے! ورنہ میری تلوار اس موذی کے سینے کے پار ہو جائے گی۔"

راجہ کے اشارے پر سپاہی پیچھے ہٹ گئے تو زہیر نے پھر راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بے وقوفوں کے بادشاہ! مجھے تم سے نیک سلوک کی توقع نہیں لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جن صلاح کاروں نے تمہیں عرب کے ساتھ لڑائی مول لینے کا مشورہ دیا ہے، وہ تمہارے دوست نہیں۔ جن لوگوں پر تمہیں بھروسہ ہے، وہ سب دیبل کے حاکم کا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اس کی طرف دیکھو، یہ وہ ہمدرد ہے جو کرسی پر بیٹھا ہوا بید مجنوں کی طرح کانپ رہا ہے۔ اب میں تمہارے سامنے اس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں۔ "کیوں پرتاپ رائے! تم نے مجھے لڑ کر گرفتار کیا تھا یا دوستی کا فریب دے کر جہاز سے بلایا تھا؟ جواب دو، خاموش کیوں ہو! اگر تم نے جھوٹ بولا تو یاد رکھو، ان سپاہیوں کی حفاظت سے تم نہیں بچ سکتے۔ بولو! یہ کہتے ہوئے زہیر نے تلوار کو آہستہ سے جنبش دی اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "میں نے تمہیں جہاز پر سے بلایا تھا لیکن ہمارا حکم تھا کہ تمہیں ہر قیمت پر گرفتار کیا جائے۔"

راجہ نے کہا: "ٹھہرو! پرتاپ رائے نے ہمارے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے

گا۔ جسے تم تصور میں بھی برداشت نہ کر سکو گے ابھی ہم نے تمہارے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم خواجہ عرب کے ساتھ بگاڑ نہیں چاہتے۔ تمہاری قوم واقعی بہادر ہے لیکن اگر تم ذرا سمجھ سے کام لو تو ممکن ہے ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو آزاد کر دیں۔ تمہارے سر پر اس وقت بیس سپاہی کھڑے ہیں۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکو گے لیکن اس وقت ایک آدمی کے بدلے ہم تمام قیدیوں کو پھانسی دے دیں گے۔ اگر اپنے ساتھیوں کی خیر چاہتے ہو تو تلوار پھینک دو!"

زہیر نے کہا: "مجھے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں لیکن میں تمہیں اپنا نفع اور نقصان سوچنے کا آخری موقع دیتا ہوں۔ یاد رکھو! اگر تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ دن دور نہیں۔ جب تمہارے ہر سپاہی کے سر پر میرے جیسے سر پھروں کی تلواریں چمک رہی ہوں گی۔ تمہیں اگر جواہرات اور ہاتھیوں کا لالچ ہے تو میں ان کا مطالبہ نہیں کرتا۔ میں صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو رہا کر دو، خالد اور اس کی بہن کو ہمارے حوالے کر دو!"

راجہ نے جواب دیا: "جب تک تم تلوار نہیں پھینکتے، ہم تمہاری کسی درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

زہیر کو راجہ کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ اگر اُسے اپنے ساتھیوں کا خیال نہ آتا تو وہ یقیناً اپنے آپ کو راجہ کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے بہادرانہ موت کو ترجیح دیتا لیکن بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے عبرتناک انجام کے تصور نے اس کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ اسے ناہید کا خیال آیا اور اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ مختلف خیالات کے گرداب میں راجہ کے

حوصلہ افزا کلمات اس کے لیے تنکوں کا سہارا ثابت ہوئے اور اس نے اپنی تلوار تخت کے سامنے پھینک دی۔ راجہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پرتاپ رائے کی حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو بھیانک سپنا دیکھنے کے بعد نیند سے بیدار ہوا ہو۔ بڑی رانی نے راجہ کے دائیں کان میں کچھ کہا۔ ”مہاراج! ایسے لوگوں سے دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں۔“

راجہ نے اشارے سے وزیر کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے پوچھا: ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”مہاراج! مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔“
راجہ نے کہا: ”اگر میں اسے چھوڑ دوں تو یہ سردار اور میری رعایا مجھے بزدل تو خیال نہ کریں گے؟“

”مہاراج! چاند پر تھوکنے سے اپنے منہ پر چھینٹ پڑتے ہیں۔ آپ اپنی رعایا کی نظر میں ایک دیوتا ہیں لیکن اب ان قیدیوں کو چھوڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ عربوں کو یہ خبر آت نہیں ہو سکتی کہ وہ سندھ پر حملہ کریں۔ لیکن ان لوگوں کو اگر ان کے ملک میں واپس بھیج دیا گیا تو یہ تمام عرب میں ہمارے خلاف آگ کا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کر کے مکران کا علاقہ حاصل کرنے کا ارادہ بدل چکے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ان سب کو آزاد کرنے کی بجائے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ عربوں کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو کہ ہم نے دیبل سے ان کے جہاز لوٹے ہیں۔ اس سے پہلے ہم ابوالحسن کے معاملے میں مکران کے گورنر کو ٹال چکے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی آن کا پتہ پوچھنے آیا تو اس کی تسلی کر دی جائے گی۔“

راجہ نے کہا: ”تمہیں کس نے بتایا کہ ہم مکران کو فتح کرنے کا ارادہ

بدل چکے ہیں۔“

وزیر نے جواب دیا: ”مہاراج! اگر آپ کا ارادہ نہیں بدلا تو پھر ان لوگوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اس کی کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے کہ شہر کے کسی چوراہے میں پھانسی دی جائے تاکہ ہمارے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عرب عام انسانوں سے مختلف نہیں!“

راجہ نے کہا: ”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن جہاز سے ایک عرب لڑکا اور لڑکی غائب ہو چکے ہیں اگر انہوں نے سندھ کی حدود پار کر کے مکران میں اور عربوں کو یہ خبر پہنچا دی تو ممکن ہے کہ ہمیں بہت جلد لڑائی کی تیاری کرنی پڑے۔“

وزیر نے جواب دیا: ”مہاراج! عرب کی موجودہ حالت مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی خانہ جنگی کو ختم ہونے زیادہ دیر نہیں ہوئی اور اب ان کی تمام افواج شمال اور مغرب کے ممالک میں لڑ رہی ہیں۔ ہمارے پاس ایک لاکھ فوج موجود ہے اور ہم ضرورت کے وقت اسی قدر اور سپاہی جمع کر سکتے ہیں۔ پھر راجپوتانے کے تمام راجہ آپ کے باج گزار ہیں۔ وہ آپ کے جھنڈے تلے عربوں سے لڑنا اپنی عزت سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جو عرب سندھ میں آئے گا، واپس نہیں جائے گا۔“

”شاباش! مجھے تم سے یہ اُمید تھی۔ تم آج ہی تیاری شروع کر دو۔“

راجہ سے کانٹا پھوسا حتم کرنے کے بعد وزیر اپنی گرسی پر آ بیٹھا۔

راجہ نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”اسے لے جاؤ! آج شام تک ہم اس کا فیصلہ کر دیں گے۔“

آخری اُمید

رات کے وقت سونے سے پہلے داسو نے کئی بار نراتن داس سے بے رام کے واپس نہ آنے کی وجہ پوچھی لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ شہر میں اُس کے کئی دوست ہیں۔ کسی نے اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا ہوگا۔ داسو کو بے رام کی ہدایت تھی کہ وہ اس کے واپس آنے تک نراتن داس کے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اگلے دن بھی اس نے طوعاً و کرہاً بے رام کی اس ہدایت پر عمل کیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے نراتن داس نے آکر یہ خبر دی کہ بے رام کو ایک عرب کے ساتھ پنجرے میں بند کر کے شہر میں پھرایا جا رہا ہے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ان دونوں کو شہر کے چوراہے میں پھانسی دے دی جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس نے بھرے دربار میں راجہ کے سامنے گستاخی کی ہے۔

داسو نے یہ سُننے ہی شہر کا رخ کیا۔ لوگ شہر کے ایک پُر رونق چوراہے میں ایک بالنس کے پنجرے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ داسو اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا پنجرے کے قریب پہنچا اور پنجرے کے اندر زیر اور بے رام کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اٹے پاؤں لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوٹے پر سوار

بچ جائیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید ابھی بھونچال کے جھٹکے سے یہ شہر مٹی کا ایک ڈھیر بن جائے گا۔ کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید بھگوان کا کوئی اوتار آسمان سے اتر کر راجہ سے کہے کہ ان بے گناہوں کو چھوڑ دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ کبھی مجھے یہ امید سہارا دیتی ہے کہ شاید دریائے سندھ اپنا راستہ چھوڑ کر دیبل کا رخ کر لے اور لوگ بدحواس ہو کر شہر سے بھاگ نکلیں اور جاتے جاتے ہمیں آزاد کر جائیں۔ تمہیں اس قسم کا کوئی خیال نہیں آتا؟

”نہیں! مجھے ایسے خیالات پریشان نہیں کرتے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر خدا کو میرا زندہ رکھنا منظور ہے تو وہ ہزار طریقوں سے میری جان بچا سکتا ہے اور اگر میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں تو میری کوئی تدبیر مجھے موت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔“

جے رام نے کہا: ”زیر! کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتا لیکن میں جوان ہوں اور ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی جوان ہو لیکن تمہارے سوچنے کا ڈھنگ مجھ سے مختلف ہے۔“

زیر نے کہا: ”تم بھی اگر میری طرح سوچنے کی کوشش کرو تو دل میں تسکین محسوس کرو گے۔“

جے رام نے جواب دیا: ”یہ میرے بس کی بات نہیں۔“

زیر نے کہا: ”جے رام! میری ایک بات مانو گے؟“

”وہ کیا؟“

”صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ میری اور تمہاری زندگی کے شاید تھوڑے سالس باقی ہیں۔ میرے دل پر صرف ایک بوجھ ہے اور اگر تم چاہو تو میں موت سے پہلے اس بوجھ کو اپنے دل سے اتار سکتا ہوں!“

ہو کر جنگل کا رخ کر رہا تھا۔

شہر میں آدھی رات تک چند پریداروں کے سوا تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جے رام زیر کو جنگل میں خالد ناہید اور مایا سے ملاقات کا واقعہ سنا چکا تھا۔ چند پرے دار سوچکے تھے اور باقی پنجرے کے قریب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زیر نے موقع پا کر کہا: ”وہ رمال کہاں ہے؟“

جے رام نے جواب دیا: ”وہ میری کلانی کے ساتھ بندھا ہوا ہے لیکن ہم دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ کاش! داسو کو ہماری خبر ہو جاتی۔ زیر! زیر!! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں!“

”پوچھو!“

”ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں اس وقت سب سے زیادہ کس بات کا خیال آ رہا ہے؟“

”میرے دل میں صرف ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اب تک خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خوش کرنے کے لیے دنیا میں کوئی مفید کام نہیں کر سکا۔“

”تمہیں مرنے کا خوف تو ضرور ہوگا؟“

”ایک مسلمان کے ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ موت سے نہ ڈرے اور ڈرنے سے فائدہ ہی کیا۔ انسان خواہ کچھ کرے۔ جو رات قبر میں آئی ہو، قبر ہی میں آئے گی۔ اگر میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں تو میں آنسو بہا کر انہیں زیادہ نہیں کر سکتا لیکن مجھے ایک افسوس ہے کہ ایسی موت ایک سپاہی کی شان کے شایاں نہیں۔“

جے رام نے کہا: ”مجھے ابھی تک یہ خیال آ رہا ہے کہ شاید ہم اس سزا سے

میں داخل ہو چکا تھا۔

زیر نے پوچھا: ”اب بتاؤ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہے یا نہیں؟“
 بے رام نے کہا: ”میرے دل میں صرف ایک اضطراب باقی ہے اور وہ
 یہ کہ میں نے موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ کاش میں چند دن
 اور زندہ رہ کر تمہاری طرح نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا۔“
 زیر نے جواب دیا: ”ایک مسلمان کو خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے وہ
 سب کچھ کر سکتا ہے۔“

(۳)

پہرے دار نے کسی کو پتھر کے قریب آتے دیکھ کر آواز دی۔
 ”کون ہے؟“

ایک آدمی جواب دیے بغیر پتھر کے قریب پہنچ کر گرکا۔ چند اور سپاہی
 اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے سپاہی نے پھر کہا: ”جواب نہیں دیتے۔ تم کون ہو؟“
 لیکن اتنی دیر میں چند سپاہی اُسے پہچان چکے تھے اور ایک نے پرانے
 ساتھی کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ”گنواروں کی طرح آوازیں دے رہے ہو
 انہیں پہچانتے نہیں، یہ سردار بھیم سنگھ ہیں۔ مہاراج آپ اس وقت کیسے؟“
 ”میں قیدیوں کو دیکھنے آیا تھا!“

دوسرے سپاہی نے کہا: ”مہاراج! آپ بے فکر رہیں۔ یہ چند آدمی
 ابھی سوئے ہیں!“

بھیم سنگھ نے اس سے پوچھا: ”تمہارا نام کیا ہے؟“
 اس نے جواب دیا: ”مہاراج! میرا نام سروپ سنگھ ہے۔“

بے رام نے کہا: ”میں اس پتھرے میں تمہارے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں اس
 کے لیے تیار ہوں۔“

”بے رام! ہم نے زندگی کی چند منازل ایک دوسرے کے ساتھ طے کی
 ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد ہمارے راستے مختلف ہوں میں چاہتا
 ہوں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر تم اس وقت بھی کلمہ توحید پڑھ لو تو میری گزشتہ
 کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ اب اتنا وقت نہیں کہ میں تمہیں اسلام کی تمام
 خوبیوں سے آگاہ کر سکوں۔ کاش! میں جہاز پر اس ذمہ داری کو محسوس کرتا لیکن
 اگر تم میری باتوں پر توجہ دو تو مجھے یقین ہے کہ تم جیسے نیک دل اور صداقت
 دوست آدمی کو صحیح راہ دکھانے کے لیے ایک لمبے عرصے کی ضرورت نہیں۔“

بے رام نے کہا: ”اگر تمہاری باتیں مجھے موت کے خوف سے نجات دلا
 سکتی ہیں۔ تو میں سننے کے لیے تیار ہوں۔“

زیر نے کہا: ”اسلام انسان کے دل میں صرف ایک خدا کا خوف پیدا
 کرتا ہے اور اُسے ہر خوف سے نجات دلاتا ہے۔ سنو! یہ کہہ کر زیر نے نہایت
 مختصر طور پر اسلام کی تعلیم پر روشنی ڈالی۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)
 کی زندگی کے حالات بیان کیے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی
 سیرت پر روشنی ڈالنے کے لیے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات بیان کیے۔
 اختتام پر زیر اجنادین، یرموک اور قادسیہ کی جنگوں کے واقعات بیان کر رہا
 تھا اور بے رام یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ساری عمر تاریک غار میں بھٹکنے کے بعد
 ایک ہی جست میں روئے زمین کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی
 آنکھوں میں امید کی روشنی جھلک رہی تھی۔

رات کے تیسرے پہرے رام برسوں کے اعتقادات کو پھوڑ کر دائرہ اسلام

میں صرف یہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ تم نے اس لڑکی اور لڑکے کو کہاں چھپایا ہے؟
”مجھے ان کا کوئی علم نہیں۔ جادو مجھے تنگ نہ کر دو۔“

زبیر کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ بھیم سنگھ نے اس کے ہاتھ میں خنجر دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے یہ خنجر توڑ کر بھاگ نکلتا ممکن نہیں لیکن پھر بھی قسمت آزمائی کر دیکھو۔ اگر تم آزاد نہ بھی ہو سکتے تو کم از کم بہادروں کی موت مر سکو گے۔“

سپاہیوں کو مغل لٹے میں ڈالنے کے لیے بھیم سنگھ نے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ عرب لڑکی کو تم نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ اچھا تمہاری مرضی، نہ بتاؤ لیکن یاد رکھو، سورج نکلنے سے پہلے برہمن آباد کے باشندے تمہیں پھانسی کے تختوں پر دیکھ رہے ہوں گے۔“

بھیم سنگھ نے خنجر سے چند قدم دور جا کر سپاہیوں سے کہا۔ ”تم ایک طرف کیوں کھڑے ہو۔ مجھے ان سے کوئی مخفی بات نہیں کرنی تھی۔ ذرا اس بے رام کو دیکھو، اس کا غرور ابھی تک نہیں ٹوٹا۔“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”مہاراج! اس کی قسمت بُری تھی۔ ورنہ ہم نے سنا ہے کہ راجہ اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ مہاراج! شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ عرب جادوگر ہے۔ اس نے جادو کی طاقت سے بے رام کو راجہ کا نافرمان بنا دیا تھا۔“

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”شاید یہی بات ہے۔ مجھے بھی اس کے خنجر کے قریب نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”نہیں مہاراج! آپ پر اس کے جادو کا کیا اثر ہوگا۔ پھر بھی آپ گھر جا کر پرارتھنا کریں۔“

”تم بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں برہمن آباد کے حکم سے سفارش کروں گا کہ تمہیں ترقی دی جائے!“

”بھگوان سداکار کا بھلا کرے۔ میرے چار بچے ہیں۔ آپ کے ہونٹ ہلیں گے اور میرا کام بن جائے گا!“

”تم فکر نہ کرو۔ ہاں قیدی سو رہے ہیں؟“
”مہاراج ابھی باتیں کر رہے تھے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر خنجرے میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ”مہاراج! یہ جاگ رہے ہیں!“

”مہاراج! آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ خنجرے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔“
بھیم سنگھ نے خنجرے میں جھانکتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”جے رام تم بہت بے وقوف ہو۔“ اور پھر اپنا ہاتھ خنجرے میں ڈال کر زبیر کا بازو ٹٹولتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”تم اپنے ہاتھ میری طرف کر دو۔“ زبیر نے اپنی پیٹھ پھیر کر اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اس کی طرف کر دیے۔ بھیم سنگھ نے دوبارہ بلند آواز میں کہا۔ ”نمک خرام! تمہیں راجہ کے سامنے اس لمبے عرب کی دوستی کا دم بھرتے ہوئے شرم نہ آئی۔“ اور پھر آہستہ سے کہا۔ ”جے رام! میں تمہارے ساتھی کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ رہا ہوں۔ کچھ بولو اور نہ سپاہیوں کو شک پڑ جائے گا۔“

جے رام نے چلا کر کہا۔ ”بھیم سنگھ شرم کر دو۔ یہ ایک راجپوت کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ کسی کو بے بس دیکھ کر گالیاں دے!“
”میں تمہارے جیسے بزدل آدمی کو گالیاں دینا اپنی بے عزتی سمجھتا ہوں۔“

”تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں جاتا ہوں، میرا سرچکرا رہا ہے۔ شاید یہ جادو کا اثر ہے!“

”ہمارا ج! اگر حکم ہو تو ہم میں سے کوئی ایک آپ کو گھر چھوڑ آئے؟“

”نہیں! نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔“

بھیم سنگھ چل دیا تو سپاہی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا: ”ہمارا ج! میرا خیال رکھنا!“

”تم فکر نہ کرو!“

”ایشور آپ کا بھلا کرے۔“

بھیم سنگھ کے چلے جانے کے بعد ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ جادو گر ہے اور تم نہیں مانتے تھے۔ سرورپ سنگھ تمہاری خیر نہیں۔ تم کئی بار پنجرے کو ہاتھ لگا چکے ہو۔ اب تک تمہارا سر نہیں چکرایا؟“

”میرا سر —؟ ہاں کچھ بو بھل سا ضرور ہے۔“

”فکر نہ کرو، ابھی چکرانے لگ جائے گا۔“

”سرورپ سنگھ نے فکر مند سا ہو کر کہا: ”لیکن میں نے سنا ہے کہ جادو گر کے مرجانے پر جادو کا اثر نہیں رہتا۔“

”ایسے جادو گر مر کر پھر زندہ ہو جاتے ہیں!“

ایک اور سپاہی بولا: ”یاد میں نے بھی پنجرے کو ہاتھ لگایا تھا۔ میرا سر بھی چکرا رہا ہے۔“

سرورپ سنگھ بولا: ”بھگوان ایسے جادو گر کو غارت کرے۔ اب میرا سر سچ مچ چکرا رہا ہے!“

ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ سپاہی آٹھ دس قدم ہٹ کر پرہ دینے لگے۔

زبیر پنجرے کے اندر اپنے پاؤں کی رسیاں کاٹنے کے بعد بے رام کے ہاتھ پاؤں بھی آزاد کر چکا تھا اور دونوں پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔

ایک سپاہی نے چلا کر کہا: ”ارے وہ پنجرے میں کیا کر رہے ہیں۔“

زبیر اور بے رام دہک کر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کر کے ختم آنے لینے لگے۔ دو سپاہیوں نے پنجرے کے گرد چکر لگایا اور مطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

بے رام نے آہستہ سے کہا: ”زبیر!“

اس نے جواب دیا: ”کیا ہے؟“

”یہ سلاخیں بہت مضبوط ہیں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے، کیا تمہیں اب بھی چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی امید ہے؟“

”میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خدا ہماری مدد کرے گا!“

بے رام نے کہا: ”برہمن آباد میں سینکڑوں سپاہیوں پر بھیم سنگھ کا اثر ہے شاید وہ آخری وقت پر ہماری مدد کرے۔“

”میں صرف خدا سے مدد مانگتا ہوں اور تمہیں بھی اسی کا سہارا لینا چاہیے اگر اُسے ہمارا زندہ رکھنا منظور ہے تو ہم بھیم سنگھ کی مدد کے بغیر بھی رہا ہو جائیں گے۔“

”میں تمہارے ایمان کی کچنگی کی داد دیتا ہوں لیکن بُرا نہ مانا یہ سلاخیں خود بخود ٹوٹنے والی نہیں۔“

زبیر نے کہا: ”بے رام! جہاں عقل کے چراغ گل ہو جاتے ہیں وہاں

ایمان کی مشعل کام دیتی ہے۔ تم ایک ایسے خدا پر ایمان لا چکے ہو، جس نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا تھا۔“

جے رام کچھ کہنے والا تھا کہ باہر سے ایک سپاہی چلا آیا۔ ”کون ہے؟“ ایک شخص نے چند قدم کے فاصلے سے جواب دیا۔ ”جی میں ماہی گیر ہوں!“

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”جی میں مچھلیاں لایا ہوں۔“

”مچھلیاں! اس وقت؟“

”جی اب دن نکلنے والا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ انھیں بیچ کر جلدی واپس چلا جاؤں۔ آپ کو کوئی مچھلی چاہیے؟“

ایک سپاہی نے کہا۔ ”سروپ سنگھ! تم نے تو، تمہارے چار بچے ہیں۔“

پچھیرے نے کہا۔ ”ہاں سرکار نے تو بالکل تازہ ہیں۔“

سروپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”ہم اس وقت پیسے باندھ کر تھوڑا بیٹھے ہیں۔ مفت دینی ہے تو دے جاؤ۔“

”جی! شہر کے عام لوگ بھی ہم سے مفت چھین لیتے ہیں۔ آپ تو سپاہی ہیں، آپ سے پیسے کون مانگ سکتا ہے!“

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر نے مچھلیوں کی ٹوکری سپاہیوں کے آگے رکھ دی۔

ایک سپاہی نے کہا۔ ”اے تمہارے پاس تو کافی مچھلیاں ہیں۔ ہمیں بھی دو گے یا نہیں؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

پیسے کما سکتا ہے۔“

گنگو کے ساتھی ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے اس کی تانوں نے گہری تیند سے بیدار کیا ہے اور پھر میرا سونے کو جی نہ چاہا۔“

”مجھے دسنتی کی ناں کہتی تھی کہ جاؤ دیکھو کوئی فقیر ہوگا۔“ اے میرے

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

میں تو اس کا روز کا گاہک ہوں۔ میں مفت تھوڑا لے رہا ہوں۔ کل پیسے ادا کر دوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے سروپ سنگھ نے ایک مچھلی اٹھالی اور شرارت آمیز تبسم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا اور انھوں نے ہنستے ہوئے آن کی آن میں تمام ٹوکری خالی کر دی۔

سروپ نے کہا۔ ”لو بھئی! تمہارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب کل اسی جگہ اور اسی وقت پیسے لے لینا۔“

”بہت اچھا سرکار!“

پنجرے کے اندر زبیر جے رام سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ گنگو ہے لیکن یہ اکیلا کیوں آیا؟“

گنگو نے سپاہیوں سے کہا۔ ”مجھے الغوزہ بجانا آتا ہے۔ آپ کو سناؤں؟“

سپاہیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہاں ہاں سناؤ!“

گنگو نے الغوزے سے چند دلکش تانیں نکالیں اور اس کے ساتھی عام شہریوں کے لباس میں مختلف گلیوں سے نکل کر سپاہیوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اے اس نے تو خواہ مخواہ پچھیرے کا ذلیل پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ تو الغوزہ بجا کر کافی پیسے کما سکتا ہے۔“

گنگو کے ساتھی ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے اس کی تانوں نے گہری تیند سے بیدار کیا ہے اور پھر میرا سونے کو جی نہ چاہا۔“

”مجھے دسنتی کی ناں کہتی تھی کہ جاؤ دیکھو کوئی فقیر ہوگا۔“ اے میرے

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔“

گنگو الغوزہ بجاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھی اچانک تلواریں سونت کر سپاہیوں پر پل پڑے اور ان کی آنکھیں اُنی کا صفایا کر دیا۔ داسو نے کھانڈے کی چند ضربوں سے پتھرے کا دروازہ توڑ دیا اور بے رام اور زبیر لپک کر باہر نکل آئے۔

چوک کے آس پاس کی آبادی نے الغوزے کی دلکش تانوں کے بعد حملہ آوروں اور سپاہیوں کی غیر متوقع چیخ پکار سنی لیکن اپنے گھروں سے باہر نکل کر دیکھنے کی جسرات نہ کی۔ زبیر اور بے رام گنگو اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ بھاگتے ہوئے شہر سے باہر نکلے۔ گنگو کے چند ساتھی ایک باغ میں گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

جس وقت شہر میں اس ہنگامے کا رد عمل شروع ہو رہا تھا یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کا رخ کر رہے تھے :

(۴)

ناہید اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مایا اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر دبا رہی تھی۔ خالد بے قراری کے ساتھ کمرے میں ادھر ادھر ٹھٹھا ہوا بستر کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔ "ناہید بہت دیر ہو گئی۔ انہیں اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کاش! میں یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہ ہوتا۔" مایا نے خالد کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا کر تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ راجہ داہر اس قدر ظالم ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ داسو۔"

خالد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہاری نیک خواہشات

ایک بھڑیلے کو انسان نہیں بنا سکتیں۔"

مایا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں، وہ آجائیں گے!" "زبیر پچاسنی پر لٹک رہا تھا اور مجھے فکر نہ ہو۔ کاش! میں گنگو کے ساتھ ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے خالد نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور ہونٹ کاٹا ہوا باہر نکل گیا۔ مایا دیوی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ناہید کی طرف دیکھنے لگی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "مایا! اس نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔ تم ذرا اسی بات پر رو پڑتی ہو۔"

مایا نے جواب دیا۔ "آج ان کے تیور دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ ناکام آئے تو کیا ہوگا؟"

ناہید نے کہا۔ "وہ ایک خطرناک مہم پر گئے ہیں اور ان کی کامیابی اور ناکامی میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔"

اگر گنگو اور اس کے ساتھی بھی لڑائی میں مارے گئے تو آپ اپنے وطن چلے جائیں گے اور میں....."

ناہید نے جواب دیا۔ "میری ننھی بہن! تم اپنے لیے عرب کی زمین تنگ نہ پاؤں گی!"

"لیکن خالد آج بات بات پر مجھ سے بگڑتے ہیں ممکن ہے کہ وہ مجھے یہیں چھوڑ جائیں۔"

"مایا! میرے سامنے خالد نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ ہاں تمہارے بھائی اور زبیر کے متعلق یہ المناک خبر سننے کے بعد وہ کچھ بے قرار سا ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندہ بچ کر آجائیں۔ تو پھر خالد کے چہرے پر تمام عمر مسکراہٹیں دیکھا کر دو گی۔"

قلعے کا ایک پریدار بھاگتا ہوا آیا۔ ناہید نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پریدار نے کہا: ”خالد گھوڑے پر زین ڈال رہے ہیں۔ وہ میرا کہا نہیں مانتے۔ انھیں برہن آباد کاراستہ بھی معلوم نہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو گنگو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ انھیں منع کریں!“

ایک لمحہ کے لیے مایا کا دل بیٹھ گیا۔ پھر زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ اٹھی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی قلعے سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل یہ کہہ رہا تھا۔ ”خالد مت جاؤ! امت جاؤ! میں بھائی کا غم برداشت کر سکتی ہوں لیکن تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ خالد مجھ پر رحم کرو۔ خالد! خالد!“

قلعے سے باہر خالد گھوڑے کی لگام تھام کر اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا۔ مایا نے بھاگتے ہوئے آواز دی: ”ٹھہرو! خدا کے لیے! ٹھہرو!“ اکیلے مت جاؤ! میں تمہارے ساتھ ہوں“ یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

خالد نے اپنا پاؤں رکاب سے نکال لیا اور پریشان سا ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں ناہید بھی باہر آ چکی تھی۔ مایا ناہید کی طرف متوجہ ہو کر بولی: ”ہن انھیں روکو! یہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ بھگوان کے لیے! خدا کے لیے! انھیں روکو!“

ناہید نے ان کے قریب پہنچ کر کہا: ”خالد! اگر تمہارے جانے میں کوئی مصلحت ہوتی تو میں اس بے کسی کے باوجود تمہارا راستہ نہ روکتی۔ تم اکیلے شہر میں راجہ کے تمام لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں گنگو کا انتظار کرنا چاہیے وہ ضرور آئے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور آئے گا۔ بیشک

خالد کی مسکراہٹوں کا ذکر مایا کو تھوڑی دیر کے لیے تصورات کی حسین دنیا میں لے گیا۔ اسے یہ اجڑی ہوئی دنیا مہکتے ہوئے پھولوں کی ایک کیاری دکھائی دینے لگی۔ وہ پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ مہکتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ چڑیوں کے چچھے سن رہی تھی۔ وہ ایک عورت تھی جسے محبت تنکوں کا سہارا لینا اور امید دریا کے کنارے مٹی کے گھر وندے بنانا سکھاتی ہے لیکن ایک خیال بادِ سموم کے تیز جھونکے کی طرح آیا اور مایا کے دامنِ امید میں مہکتے ہوئے پھول مڑ جھاگئے۔ تصور کی نگاہیں عرب کے ریگزاروں اور نخلستانوں میں گھومنے کے بعد برہن آباد کے چوراہے میں اپنے بھائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا ہوا دیکھنے لگیں۔ وہ ایک بہن تھی ایسی بہن جو اپنے گھر میں مسرت کے قہقہے سننے کے باوجود بھائی کی ایک ہلکی سی آہ پر چونک اٹھتی ہے۔ مایا نے اپنے دل میں کہا: ”بھیا! میرے بھیا!“ خدا تمہیں واپس لائے۔ تمہارے بغیر مجھے کسی کی مسکراہٹ خوش نہیں کر سکتی!“

ناہید نے اس کی طرف ٹٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا: ”مایا! تمہیں واقعی خالد سے اس قدر محبت ہے“

مایا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگی۔

ناہید نے پھر کہا: ”مایا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا۔ میں خالد کو جانتی ہوں۔ وہ.....“

مایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”نہیں! میں نہیں! میں اپنے بھائی کے متعلق سوچ رہی ہوں۔“

کے بحر بیکراں میں ٹوٹی ہوئی کشتی کے اس ملاح سے مختلف نہ تھی جو اٹھتی ہوئی لہر کو ساحل سمجھنے کا دھوکا کھا چکا ہو۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ تقدیر آخری بار امید کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھین رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گھوڑا بھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوا۔ سوار نے قریب پہنچ کر باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے سے کود کر مایا کی طرف بڑھا۔ مایا "بھیا! میرا بھیا!" کہتی ہوئی بھاگ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ناہید اور خالد کی نگاہیں بھاڑیوں کی طرف اٹھیں۔ بے رام کو دیکھ کر ناہید زہیر کے متعلق پھر ایک بار امیدوں کے چراغ روشن کر رہی تھی۔ بے رام کے بعد داسو اور اس کے پیچھے گنگو اور زہیر بھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوئے۔ زہیر کو دیکھ کر ناہید جھجکتی ہوئی دو تین قدم آگے بڑھی۔ زہیر اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر۔ خالد بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ ناہید نے چاہا کہ بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچ جائے لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے پاؤں زمین میں پیوست ہو چکے ہیں۔ اس کے اعضاء زمین رعنہ تھا۔ اس کا سر چکر رہا تھا۔ مہینوں کے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو اچانک اپنے قریب دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔

زہیر خالد سے علیحدہ ہو کر آگے بڑھا اور بولا۔ "ناہید اب تم اچھی ہونا!"

وہ جواب دینے کی بجائے اپنے چہرے کا نقاب درست کرنے لگی۔ زہیر نے پھر کہا۔ "ناہید! تمہارا زخم کیسا ہے؟"

ناہید کے ہونٹ کپکپائے، اس نے لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ آگے۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس کے آخری الفاظ ایک گرمی سانس میں ڈوب کر رہ گئے اور وہ لڑکھڑاکر زمین پر گر پڑی۔

تم بہادر ہو لیکن ایسے موقع پر صبر سے کام لینا ہی بہادری ہے۔"

خالد نے جواب دیا۔ "آپا! تمہیں بخا ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔ میں صرف ان کی راہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں دور نہیں جاؤں گا۔"

مایا نے کہا۔ "نہیں! نہیں! بہن! انہیں مت جانے دو۔ یہ واپس نہیں آئیں گے۔"

خالد نے کہا۔ "مایا! ممکن ہے کہ راجہ کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے ہوں۔ ان کی مدد میرا فرض ہے۔ تم اپنے بھائی کا خیال کرو!"

مایا نے جواب دیا۔ "میرا بھائی اگر خطرے میں ہے تو آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے۔"

خالد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دور سے ایک شخص جو درخت پر چڑھ کر پہرہ دے رہا تھا چلا یا۔ "وہ آرہے ہیں۔" اور مٹا جنگل میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک اور پہرے دار بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ "شاید دشمن ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ تم قلعے کے تہ خانے میں چھپ جاؤ۔"

خالد نے اطمینان سے جواب دیا۔ "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اگر سپاہی ان کے تعاقب میں ہوتے تو وہ اس طرف نہ آتے لیکن یہ تو بہت تھوڑے گھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز قریب آرہی تھی اور خالد نے دوسری بار چونک کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار گھوڑے واپس آئے ہیں۔"

گھوڑوں کی آمد کی خبر پا کر ناہید نے اپنے دل میں ایک زبردست ٹھٹھکی محسوس کی اور جب خالد نے یہ کہا کہ صرف چار گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی ہے تو امید کے چراغ روشن ہو کر اچانک بجھ گئے۔ اس کی حالت غم داندہ

خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ آپ فوراً روانہ ہو جائیں۔ واپس آنے میں دیر نہ کریں۔ ہاں میں علی کا حال پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”علی آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ دیبل کے گورنر نے اُسے بہت اذیت دی، لیکن وہ ایک بہادر لڑکا ہے۔ وہ خواہ کسی حالت میں ہو۔ نماز کے وقت اذان ضرور دیتا ہے۔ یہ لوگ اذان سے بہت گھبراتے ہیں۔ اسے بارہا کورڑوں کی سزا دی جا چکی ہے لیکن اس کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ برہمن آباد کے قید خانے میں بھی اس کا یہی حال ہے۔ راجہ کے سپاہی اسے زبان کاٹ ڈالنے کی دھمکی دے چکے ہیں لیکن اس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔“

ناہید نے کہا: ”یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے۔ ورنہ وہ اتنے مضبوط دل کا مالک نہ تھا۔ سرانندپ میں اسے ایک کمزور لڑکا سمجھا جاتا تھا۔“

زیر نے جواب دیا: ”انسان کے عیوب و محاسن صرف خطرے کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔“

دروازے پر سے گنگو نے آواز دی: ”اب دوپہر ہونے والی ہے۔ آپ کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

ناہید نے کہا: ”آپ جائیں! خدا آپ کی مدد کرے لیکن آپ کو مکران تک خشکی کا راستہ معلوم ہے؟“

زیر نے جواب دیا: ”داسو میرے ساتھ جا رہا ہے اور وہ تمام راستوں سے واقف ہے۔ میں مکران کی سرحد پر پہنچ کر اُسے واپس بھیج دوں گا!“

مایا نے کہا: ”لیکن اس لباس میں آپ فوراً پہچانے جائیں گے۔“

زیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”میری ننھی بہن کو میرا بہت خیال ہے لیکن اُسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ایک سندھی کا لباس پہن کر جاؤں گا۔“

(۴)

جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ خالد اور مایا کے مغموم چہرے دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں زیر پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ مہرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک حیا کی سرخی چھا گئی اور وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ گنگو اور بھجے رام دروازے سے باہر کھڑے تھے۔ خالد نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”ناہید کو ہوش آ گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ زیر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”ناہید! اب ہماری مصیبت ختم ہونے والی ہے، میں آج ہی جا رہا ہوں!“

مایا ایک عورت کی ذکاوت حس سے زیر کے متعلق ناہید کے جذبات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا: ”نہیں آپ یہیں ٹھہریں۔ اس وقت سارے سندھ میں آپ کی تلاش ہو رہی ہوگی۔“

زیر نے جواب دیا: ”میرے لیے سندھ کی سرحد پار کرنے کا یہی ایک موقع ہے۔ کل تک تمام راستوں کی چوکیوں کو ہمارے فرار ہونے کی اطلاع مل جائے گی۔ ہمارے باقی ساتھی راجہ کے سپاہیوں کو چکمہ دینے کے لیے مشرق کے صحرا کا رخ کر رہے ہیں۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ خالد! تم یہیں رہو گے۔ اگر اس جگہ کوئی خطرہ پیش آیا تو گنگو تمہیں کسی محفوظ مقام پر لے جائے گا۔ عرب سے ہماری افواج کی آمد تک اگر ناہید گھوڑے پر چڑھنے کے قابل ہو گئی تو گنگو تمہیں مکران پہنچا دے گا!“

ناہید نے کہا: ”جب تک میری بہنیں قید میں ہیں۔ میں یہیں رہنا پسند کروں گی۔ خدا آپ کو جلد واپس لائے! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ میرا

ہوں۔ اور اب تو میں سندھ کی زبان بھی سیکھ چکا ہوں۔ کوئی مجھ پر شک نہیں کئے گا۔“

مایا نے کہا۔ ”آپ مجھے بہن کہہ کر بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے رہے ہیں۔ یاد رکھیے ہمارے ملک میں دھرم کے بہن بھائیوں کا رشتہ سگے بہن بھائیوں کے رشتے سے کم مضبوط نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھے اپنی بہن کہتے ہیں تو بہنوں کا سفر دنوں میں طے کیجیے۔ ہماری مصیبت آپ کے ساتھیوں کی مصیبت سے کم نہیں۔ وہ میرے بھائی کی تلاش میں سندھ کا کونہ کونہ چھان ماریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کی افواج کے آنے سے مایوس ہو کر کہیں میرا بھائی کا ٹھکانا کی طرف فرار ہونے پر آمادہ نہ ہو جائے؟“

جے رام نے باہر سے بلند آواز میں کہا۔ ”مایا کیا کہتی ہو۔ میں ایک راجپوت ہوں۔ نہیں، بلکہ ایک مسلمان بھی ہوں۔ میں اپنے محسنوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں؟“

”مسلمان؟ میرا بھائی ایک مسلمان؟“ مایا یہ کہتی ہوئی ناہید کی چادر پانی سے اٹھ کر بھاگی اور باہر نکل کر جے رام سے لپٹ گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ”بھیا! سچ کہو تم مسلمان ہو گئے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”مایا! پاس کے ساتھ مَس ہو کر لوہا، لوہا نہیں رہ سکتا۔ تم روٹھ تو نہ جاؤ گی؟“

”میں۔۔۔؟“ اس نے الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں کیسے روٹھ سکتی ہوں۔ خدا نے میری دعائیں سُن لیں۔ میری منتیں قبول کر لیں بھیا مبارک ہو لیکن تمہارا اسلامی نام؟“

زیر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری کوتاہی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو

تمہارے بھائی کا نام ناصر الدین رکھتا ہوں!“

”اور میرا نام؟“

خالد، زیر، گنگو اور جے رام حیران، ذکر مایا کی طرف دیکھنے لگے۔ مایا نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر کہا۔ ”تم حیران کیوں ہو۔ ناہید سے پوچھو۔“ وہ یہ کہہ کر دھلیز میں کھڑی ہو گئی اور ناہید کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”ناہید بہن! انھیں بتاؤ! کیا میں نے تمہارے سامنے کلمہ نہیں پڑھا؟ کیا میں نے چھپ چھپ کر تمہارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھیں؟ کیا میں نے قرآن کی آیات یاد نہیں کیں۔۔۔؟“

مایا پھر اپنے بھائی کے پاس آکھڑی ہوئی اور زیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔ ناہید میرا نام زہرا رکھ چکی ہے اور مجھے یہ نام پسند ہے۔“

خالد نے اندر آ کر ناہید کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”تم نے یہ باتیں مجھ سے کیوں چھپائیں؟“

ناہید نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”مایا کو اس بات کا ڈر تھا کہ آپ یہ خیال کریں گے کہ وہ آپ کو خوش کرنے کے لیے مسلمان ہوئی ہے۔ اسے اپنے بھائی کا خوف بھی تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے وعدہ لے چکی تھی کہ میں فی الحال اس کا راز اپنے تک محدود رکھوں۔“ خالد پھر بھاگتا ہوا جے رام کے قریب آکھڑا ہوا۔ اسکی روح مسرت کے ساتویں آسمان پر تھی۔

زیر نے کہا۔ ”بھائی ناصر الدین، بہن زہرا! میں تم دونوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ خدا تمہیں استقامت بخشے۔“

گنگو نے کہا۔ ”زیر! اگر ہمارا دل ٹٹول کر دیکھو تو ہم سب مسلمان ہیں لیکن سب کے لیے نام سوچتے ہوئے تمہیں بہت دیر لگ جائے گی۔ یہ خدمت خالد

تمھاری مدد کرے۔ خدا تمھیں دشمنوں سے بچائے۔“
 زہرا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور وہ بولی: ”آپا! تم اب تک مجھ سے
 ایک بات چھپاتی رہی ہو۔ تمھیں ان سے محبت ہے؟“
 ناہید نے کوئی جواب دیے بغیر زہرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ گھوڑوں
 کی ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ ناہید کے کانوں سے دور ہو رہی تھی۔ آنسوؤں
 کے موتی اس کی آنکھوں سے پھلک کر رخساروں پر بہہ رہے تھے۔
 زہرا نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ”بہن وہ جلد
 آئیں گے۔ وہ ضرور آئیں گے۔“

کے سپرد کر دو۔ اب دوپہر ہو رہی ہے۔ تمھیں شام تک کم از کم یہاں سے تیس گوس
 نکل جانا چاہیے۔“
 زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”میں تیار ہوں۔“
 گنگو نے داسو کو آواز دے کر کپڑے لانے کے لیے کہا: ”زہرا پھر ناہید کے
 پاس آ بیٹھی اور زبیر نے گنگو کی ہدایت کے مطابق ایک سندھی سپاہی کا لباس زیب تن
 کیا۔ گنگو نے کہا: ”آپ کے لیے گھوڑے تیار کھڑے ہیں۔“
 ”میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ
 اس کے پاؤں کی آہٹ سن کر اپنے چہرے پر نقاب ڈال چکی تھی۔
 زبیر نے کہا: ”ناہید! خدا حافظ! بہن زہرا! میرے لیے دعا کرنا۔“
 دونوں نے جواب میں خدا حافظ کہا اور زبیر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا کمرے
 سے باہر نکل آیا۔

خالد، ناصر الدین اور گنگو نے قلعے کے دروازے تک اس کا ساتھ دیا۔
 داسو دروازے پر دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ زبیر خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر
 سوار ہو گیا۔ داسو نے اس کی تقلید کی۔ گنگو نے کہا: ”دھوپ تیز ہے لیکن یہ دونوں
 گھوڑے تازہ دم ہیں۔ تیس گوس کی پہلی منزل ان کے لیے بڑی بات نہیں۔ داسو!
 اس مہم میں تمھاری کامیابی شاید چند عینوں میں سندھ کا نقشہ بدل دے جب
 تک زبیر مکران کی سرحد عبور نہ کرے واپس نہ آتا۔“
 ”آپ بے فکر رہیں۔“ یہ کہہ کر داسو نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ زبیر نے اپنا
 گھوڑا اس کے پیچھے چھوڑ دیا۔

قلعے کے اندر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر زہرا نے ناہید کی طرف دیکھا
 ناہید کی آنکھوں میں آنسو پھلک رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی: ”خدا“